ضمیمہ

R1

جلد ۳۰

عدد ۳

ربیع الاول ۱۳۶۹ھ

ماہنامہ

ترجمان القرآن

علوم قرآنی و حقائق فرقانی کا ذخیرہ

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

دفتر رسالہ "ترجمان القرآن"

دارالاسلام جمال پور - پٹھانکوٹ

فہرست مضامین

جلد ۳ | ربیع الاول ۱۳۶۶ھ مطابق فروری ۱۹۴۷ء | عدد ۳

سید ابوالاعلیٰ مودودی پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس جیمبرلین روڈ میں چھپوا کر دارالاسلام، پٹھانکوٹ سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ترجمان کے اس پرچہ کی اشاعت میں تاخیر ہوگئی۔ اور ہم کو نہایت افسوس ہے کہ اس تاخیر سے رسالہ کی اس باقاعدگی میں خلل پڑ گیا جس کو ایک سال سے ہم مشکلات کے باوجود برقرار رکھے ہوئے تھے اور جس کو برابر باقی رکھنا چاہتے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ راقم سطور کو دو ماہ بعض تعلیمی و تبلیغی کاموں کے سلسلہ میں مرکز سے باہر جانا پڑا اور اس میں پورا مہینہ صرف ہو گیا۔ مرکز سے غیر حاضری کی ابتدا اس وجہ سے کی گئی کہ محترم مولانا ابو الاعلیٰ صاحب مودودی گردہ کے اپریشن سے فارغ ہو کر مرکز میں تشریف لا چکے تھے اور توقع تھی کہ اب ان کی صحت اس قابل ہو چکی ہے کہ وہ تمام کاموں کو سنبھال سکیں گے۔ لیکن یہ توقع پوری نہیں ہوئی۔ ابھی وہ لکھنے پڑھنے کا کام شروع بھی نہ کر پائے تھے کہ ان کے اس گردہ میں درد شروع ہو گیا جس کا اپریشن ہوا تھا اور درد کی نوعیت ایسی تھی کہ اس طرح کے درد گردہ کی اس طویل بیماری کے سلسلہ میں ان کو اب تک پہلے تجربہ نہیں ہوا تھا۔ مجبوراً پھر ڈاکٹر سے رجوع کرنا پڑا۔ ڈاکٹر نے ایکسرے کا مشورہ دیا۔ ایکسرے سے دریافت ہوا کہ گردہ میں پھر پتھریاں بننی شروع ہو گئی ہیں۔ دو تین پتھریاں چھوٹے دانوں کے برابر کی بالفعل موجود ہیں۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایکسرے کے اس انکشاف کا اس مریض پر کیا اثر ہوا ہوگا جس کو ابھی اپریشن کئے ہوئے پورا ایک مہینہ بھی نہ گذرا ہو اور جس کے گردہ سے ایک دو نہیں بلکہ چھوٹی بڑی پانچ پتھریاں نکالی جا چکی ہوں۔ قدرتی طور پر اس چیز کا مولانا پر بہت اثر ہوا۔ مرض کی تکلیف نے ان کے جسم کو بھی مضمحل کیا اور اس کے احساس نے ان کے دماغ اور اعصاب پر بھی اثر ڈالا اور اب وہ پھر اسی طرح مریض اور زیر علاج ہیں جس طرح اپریشن سے پہلے تھے اور ان کی بیماری سے وقفہ وہ سارے کام پھر تعطل اور التوا میں پڑ گئے جن کے شروع ہونے کی توقع پیدا ہو چکی تھی۔

اگرچہ وقت کے حالات کے تقاضے بہت کچھ تھے اور اس تحریک کے سلسلہ میں اندر اور باہر سے آگے کے قدم کے لیے نئے مطالبات پوری قوت کے ساتھ شروع ہو گئے تھے لیکن امیر جماعت کی اس بیماری کی وجہ سے اس اثنا میں ہماری کوشش صرف یہی ہے کہ کسی طرح جماعت کے چلتے ہوئے کاموں کو جوں توں سنبھالے رکھنے کی کوشش کی جائے اور دعوت کے بنیادی کاموں کو مضبوط کیا جائے تاکہ آئندہ جو قدم بھی اٹھے وہ کمزور نہ اٹھے۔ ہم کو اس کوشش میں کامیابی ہوئی یا نہیں اور اگر ہوئی ہے تو کس حد تک ہوئی ہے اس کا بہتر اندازہ ہم سے زیادہ دوسرے کر سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ بحالات موجودہ یہ زیادہ سے زیادہ ہے جو ہم کر سکتے ہیں اور جب تک امیر جماعت پوری طرح صحتیاب ہو کر سارے کاموں کو خود سنبھالنے کے قابل نہ ہو جائیں اس وقت تک ہم پیچ کاروں سے اگر اتنا ہی بن آئے کہ ہم بنے ہوئے کاموں کو بگاڑ نہ دیں تو ہم سمجھیں گے کہ ہم اپنے ضعف ہمت کے باوجود توفیق الٰہی سے محروم نہیں رہے اور اگر کام کو آگے نہ بڑھا سکے تو کم از کم اتنا تو کر سکے کہ اس کو گرنے سے بچا سکے۔ جو رفقاء اور مخلصین اس کام میں ہمارے ساتھ شریک ہیں ان سے درخواست ہے کہ ہماری اس مجبوری اور پریشانی پر نگاہ رکھیں اور اللہ تعالیٰ سے برابر دعا کریں کہ وہ مولانا کو اس بیماری سے نجات دے اور اقامت دین کے جس جہاد کے لیے ہم اٹھے ہیں اس کے لیے ہمیں وہ ہمت، قوت اور صبر [illegible] عطا فرمائے اور پست ہمت اور کمزور ہونے سے محفوظ رکھے۔

اس سفر کے دوران میں بعض رفقائے جماعت اور دوسرے مخلصین سے یہ معلوم ہوا کہ بعض علمی و دینی حلقوں میں یہ احساس پایا جاتا ہے کہ ہم خدانخواستہ ملک کے دینی و مذہبی مراکز کے ارباب حل و عقد اور ان کے دوسرے کارکنوں سے ملنے جلنے میں کوئی عار محسوس کرتے ہیں اور بجائے اس کے کہ ان سے مل کر اور بالمشافہ گفتگو کر کے استمالت و محبت سے ان کو اس دعوت سے قریب کریں، چاہتے ہیں کہ قلم اور زبان کے زور سے ان کو مرعوب اور اس دعوت کو قبول کرنے پر مجبور کریں۔ مجھ کو یہ بھی بتایا گیا کہ ہمارے اس طرز عمل کی وجہ سے بعض حلقوں میں اچھی خاصی غلط فہمیاں

پیدا ہو چکی ہیں اور اس بات کا اندیشہ ہے کہ بہت سے ایسے حضرات بھی جو اس دعوت سے قریب تر ہیں ہماری بیگانہ وشی اور بے پروائی کی وجہ سے نہ صرف یہ کہ اس سے دور ہو جائیں بلکہ عجب نہیں کہ بدگمان ہوتے ہوتے اس کے خلاف ایک نفرت میں مبتلا ہو جائیں اور مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوں جن دوستوں نے ان حالات کی خبر دی ہے ان کا ذاتی تاثر بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔ وہ ہر چند ہماری اس روش کو کسی غرور پر مبنی نہیں سمجھتے لیکن یہ محسوس کرتے ہیں کہ واقعہ کی حیثیت سے یہ موجود ہے اور یہ بات اس دعوت کے مزاج کے بالکل خلاف ہے جس کو لے کر ہم اٹھے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس دعوت کی کامیابی کے لیے یہ ضروری ہے کہ ملک کے کم از کم مذہبی بزرگوں کی خدمت میں حاضری دی جائے اور ان سے اس کام میں شرکت کی درخواست کی جائے اور اگر ان کے اندر اس کے خلاف کچھ بدگمانیاں ہوں تو ان کو خوبصورتی کے ساتھ رفع کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس کا کم سے کم فائدہ یہ ہوگا کہ اگر وہ اس کو قبول نہ کریں گے تو اس کی مخالفت بھی نہیں کریں گے۔ اور یہ فائدہ کوئی معمولی فائدہ نہیں ہے۔ جن کے تصرف میں لاکھوں بندگان خدا کے دلوں کے کھولنے اور بند کرنے کی کلید ہو ان سے ایک داعی حق جماعت کی یہ بے نیازی کسی طرح قرین مصلحت نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے خواہ مخواہ کی مزاحمتیں پیدا ہوں گی جن کو دور کرنے کے لیے بعد میں بڑی قوت صرف کرنی پڑے گی اور پھر بھی شاید کچھ اچھا نتیجہ نہ نکلے

اس بارہ میں یہ گذارش ہے کہ اس میں شبہ نہیں کہ جہاں تک اس ملک کے مذہبی وسیاسی بزرگوں سے ملاقاتوں اور باشافہ تبادلۂ خیالات اور ازالۂ شبہات کا تعلق ہے ہم نے اس سلسلہ میں اب تک کوئی باقاعدہ اور منظم کوشش نہیں کی ہے لیکن اس کا سبب استکبار اور غرور نہیں ہے جیسا کہ سمجھا گیا ہے۔ دلوں کی چھپی ہوئی بیماریوں کا حال تو صرف اللہ تعالیٰ کو معلوم ہے لیکن ہم جہاں تک اپنے باطن کو ٹٹول سکے ہیں اس کے اندر دوسری کمزوریاں تو پاتے ہیں لیکن الحمد للہ غرور کا کوئی شائبہ نہیں پاتے۔ اور اگر اس بیماری کا کوئی ادنیٰ اثر بھی ہمارے اندر موجود ہو تو ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ اس سے ہمارے دلوں کو پاک کر دے۔ ہم اس روگ کو اپنے اندر پالنے کی ہرگز

کوئی خواہش نہیں رکھتے۔ ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو استکبار سے زیادہ کوئی چیز ناپسند نہیں ہے۔ یہ بیماری جن لوگوں کے اندر موجود ہوتی ہے وہ نہ تو حق کو قبول کر سکتے اور وہ نہ حق کو پیش کرنے ہی کی صلاحیت رکھتے اور اگر کوئی جماعت اس بیماری کو لیے ہوئے دعوتِ حق کے میدان میں اترے گی تو وہ پہلے ہی قدم پر ٹھوکر کھائے گی اور کوئی طاقت بھی اس کو گرنے سے بچا نہ سکے گی۔ ان باتوں کو ہم اچھی طرح سمجھتے ہیں اور ان پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ تاہم شیطان کے فتنوں سے ہم غافل نہیں ہیں اس وجہ سے برابر اپنا احتساب کرتے رہتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ سے استعاذہ بھی کرتے رہتے ہیں اور اسی بات کی نصیحت ہم ان بزرگوں کو بھی کرتے ہیں بشرطیکہ اس نصیحت کو خیرسگالی پر محمول کیا جائے نہ کہ غرور پر۔ اس نصیحت کی ضرورت اس وجہ سے محسوس ہوتی ہے کہ بسا اوقات آدمی کسی کو مغرور فرض کر کے اس کے غرور کو توڑنے کے لیے خود غرور کی روش اختیار کر لیتا ہے حالانکہ اُس کا غرور محض فرضی ہوتا ہے اور اِس کا حقیقی۔ شاید مشہور حکیم دیوجانس کا قصہ ہے کہ ایک مرتبہ وہ سکندر کے دربار میں گیا اور وہاں جاکر اس نے دربار کے قیمتی قالینوں کو اکڑ اکڑ کر پامال کرنا شروع کیا۔ سکندر نے یہ منظر دیکھا تو حیران ہو کر پوچھا "دیوجانس یہ کیا؟" دیوجانس نے جواب دیا "تیرے غرور کو پامال کرنے کے لیے ایسا کر رہا ہوں"۔ سکندر نے کہا "ہاں مگر میرے غرور سے بڑے غرور سے"۔ یعنی آپ پامال تو کر رہے ہیں میرے غرور کو مگر پامال کرنے کے لیے ذریعہ بنایا ہے غرور ہی کو اور یہ غرور میرے غرور سے کہیں زیادہ ہے۔ اسی طرح ہم کو اندیشہ ہے کہ جو لوگ اس وہم میں مبتلا ہیں کہ ہم مغرور ہیں اور اس کی وجہ سے ہماری باتوں کو لائقِ التفات نہیں سمجھتے مبادا وہ اسی غلط فہمی میں مبتلا ہوں جس میں دیوجانس جیسا حکیم مبتلا تھا اور باایں ہمہ دانش و حکمت اس کو اپنی اس بیماری کا اس وقت تک پتہ نہیں چلا جب تک سکندر جیسے ایک "دنیادار" نے اس پر تنبیہ نہیں کی۔

بہرحال اگر کسی بزرگ کو ہماری نسبت یہ بدگمانی ہو کہ ہم کبر و غرور میں مبتلا ہیں اس وجہ سے اس دعوت کو پیش کرنے کے لیے ہم ان کی خدمت میں حاضری نہیں دیتے تو ہم صفائی سے عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ اس بدگمانی کے لیے کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے اور اگر خدانخواستہ اس بدگمانی کے

سبب سے وہ دعوتِ حق کا ساتھ دینے سے محروم رہے یا اس کے خلاف اپنے دلوں میں بدگمانیوں کی پرورش کرتے رہے یا ضد و عناد میں مبتلا ہو کر اس کی کھلم کھلا مخالفت پر اتر آئے تو ان ساری باتوں کی ذمہ داری ہم پر عاید نہیں ہوگی بلکہ خود ان پر عاید ہوگی اور اگر وہ ٹھنڈے دل سے غور کریں گے تو انھیں خود محسوس ہوگا کہ درحقیقت ان کا اپنا نفس ہے جو ان کو اس عناد و اختلاف پر اکسا رہا ہے نہ کہ ہم۔

ہم نے مذہبی و دینی گروہوں کے معاملے میں اب تک جو روش اختیار کی ہے اس کی بنیاد درحقیقت حسنِ ظن اور اعتماد پر ہے نہ کہ کبر و غرور پر۔ اس دعوت کے نقطۂ نظر سے مسلمانوں کے مختلف طبقات کا حال مختلف قسم کا ہے اور اسی کے اعتبار سے ہم نے ہر طبقہ سے متعلق اپنے رویہ کا تعین کیا ہے۔ اگرچہ اس بات کا امکان ہے کہ ہم نے اس رویہ کے تعین میں غلطی کی ہو لیکن ہم پر اب تک اپنے اس رویہ کی غلطی واضح نہیں ہوئی ہے اس وجہ سے ہم نے اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کی ہے۔ ہمارے سامنے سب سے مقدم سوال مسلمانوں کے اس تعلیم یافتہ طبقہ کا تھا جو پوری طرح انگریزی تہذیب و تمدن کے زیرِ اثر آکر فکر و عمل دونوں میں اسلام سے بہت دور ہٹ گیا تھا اور بدقسمتی سے یہی گروہ تھا جس کے ہاتھ میں آج عام مسلمانوں کی قیادت کی باگ تھی۔ اس گروہ کی اسی اہمیت کی وجہ سے ہم نے اپنے لٹریچر کے ذریعہ سے بھی اور نجی انفرادی و اجتماعی ملاقاتوں کے ذریعہ سے بھی پہلے اس بات کی کوشش کی کہ صحیح نظریات و افکار سے یہ گروہ متاثر ہو۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے دلوں سے دوری دور ہوئی اور وہ اسلام کو سمجھنے اور اسلامی نظامِ زندگی کو اپنانے کی طرف مائل ہوا۔ دوسرا طبقہ ان مسلمانوں کا تھا جو ہر قسم کی تعلیم سے بالکل بے بہرہ اور اسلام اور اسلامی عقائد کے تقاضوں سے بالکل ناواقف ہے۔ اس گروہ کے لیے ہم اپنے رفقاء اور ارکان اور اپنے اجتماعات اور تبلیغی دوروں کے ذریعہ سے یہ کوشش کر رہے ہیں کہ ان کے اندر اسلام کے حدود و شرائط اور اس کے تقاضوں اور مطالبات کا شعور پیدا ہو اور بحمداللہ اس سلسلہ میں ہمارا کام ایک حد تک منظم ہو گیا ہے اور اچھے نتائج سامنے آ رہے ہیں۔ تیسرا طبقہ علماء و مشائخ اور دینی اداروں کے اربابِ حل و عقد اور ان کے کارکنوں کا ہے۔ ہر چند ہم اس طبقہ سے بے پروا نہیں رہے ہیں بلکہ مختلف طریقوں

ہم نے ان سے قریب ہونے کی کوشش برابر جاری رکھی ہے ۔۔۔ بعض حضرات سے ہم نے خود ملاقاتیں کرکے ان کے سامنے اپنے مقصد کو پیش کیا ہے۔ بعض دینی اداروں میں خود پہنچ کر لوگوں کو اس فرض کی طرف توجہ دلائی ہے۔ بہت سے حضرات کی خدمت میں اپنا پورا لٹریچر اپنے خاص تعارف کے ذریعہ سے بھیجا ہے اور ان سے اس کے مطالعہ کی درخواست کی ہے۔ بعض کی خدمت میں اپنے خاص ارکان کو باقاعدہ تبادلۂ خیالات کے لیے بھیجا ہے۔ بعض حضرات جنہوں نے ہمارے کاموں پر اعتراضات کیے ہیں ہم نے اپنے علم و فہم کے مطابق ان کے شبہات و اعتراضات کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے ۔۔۔ تاہم یہ بات ایک حد تک صحیح ہے کہ ان تمام حضرات میں سے ہر ایک کی خدمت میں حاضری کی سعادت ہم کو حاصل نہیں ہوئی ہے لیکن حاشا اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے آپ کو کوئی بڑی چیز سمجھتے ہیں اور ان لوگوں کی خدمت میں حاضر ہونا کسرِ شان سمجھتے ہیں بلکہ اس کا اصلی سبب جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، وہ حسن ظن اور اعتماد ہے جو ان بزرگوں کے علم و فضل کی بنا پر ان کے ساتھ ہم نے قائم کیا تھا اور جو اب تک قائم ہے۔

ہمارے اس حسن ظن کی بنا یہ تھی کہ ہم خیال کرتے تھے کہ جس دین کی اقامت کی دعوت ہم نے شروع کی ہے وہ دین جس طرح ہم کو عزیز و محبوب ہے اسی طرح ان حضرات کو بھی عزیز و محبوب ہے۔ اس دین کے مقتضیات و مطالبات کو جس طرح ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے اس کے اصلی ماخذوں سے معلوم کیا ہے اسی طرح یہ حضرات بھی اس کے تمام ماخذوں سے آگاہ اور اس کے مقتضیات و مطالبات سے باخبر ہیں۔ جس طرح ہم یہ چاہتے ہیں کہ تمام مسلمان کام کے مسلمان بنیں اسی طرح یہ حضرات بھی یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں میں دین کا صحیح شعور پیدا ہو اور وہ اسلام کے راستہ پر چلیں۔ ہمارے خیال میں یہ تمام دینی مدارس، تمام درسگاہیں، تمام دار العلوم اور تمام خانقاہیں اسی لیے قائم ہیں کہ ان کے ذریعہ سے خدا کا دین سربلند ہو۔ پھر ہم یہ بھی جانتے تھے کہ یہ زمانہ نشر و اشاعت کا زمانہ ہے۔ ہر طرح کی چیزیں چھپتی اور شائع ہوتی ہیں اور وہ جس طرح ہر جگہ پہنچتی ہیں اسی طرح ہمارے دینی اداروں اور مذہبی مرکزوں میں بھی پہنچتی ہیں۔ اور

علما وطلبہ اور اکابر ومشائخ سب ان کو پڑھتے سمجھتے اور ان پر رائیں قائم کرتے ہیں۔ پھر اس بات کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ جہاں سب کچھ پڑھا اور سمجھا جاتا ہو وہاں ہماری ہی چیزیں لوگوں کی توجہ سے محروم رہ جائیں گی بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ یہ اسی مقصد کی دعوت دے رہی ہیں جس مقصد کے عشق کے یہ حضرات خود دعویدار ہیں۔

معاملہ کی اس نوعیت کی وجہ سے قدرتی طور پر اس گروہ کے متعلق ہمارا ہمیشہ یہ احساس رہا ہے کہ جس مقصد کی طرف ہم دعوت دے رہے ہیں یہ مقصد ہمارے اکیلے کا نہیں ہے بلکہ یہ ہمارا اور ان کا ایک مشترک مقصد ہے جس کے لیے وہ بھی وہی جوش وسرگرمی رکھتے ہیں جو جوش وسرگرمی ہم رکھتے ہیں ہم نے ان کو اس سے بیگانہ نہیں خیال کیا کہ ان کو آشنا کرنے کی ضرورت ہو، اس سے جاہل اور بے خبر نہیں سمجھا کہ ان کی تعلیم کا اہتمام کریں، اس سے منحرف اور بیزار نہیں پایا کہ اس کی طرف کھینچنے اور لانے کی ضرورت محسوس کریں، اس کا منکر اور مخالف نہیں دیکھا کہ ان کو قائل کرنے کی کوشش کریں۔ زیادہ سے زیادہ ہم جو کچھ گمان کر سکتے تھے وہ یہ تھا کہ دین کے دوسرے جزوی معاملات ومسائل نے ان حضرات کو اس قدر اپنی طرف جذب کر رکھا ہے کہ اصل فرض کی اہمیت سے یہ غافل ہو گئے ہیں۔ اس غفلت کو دور کرنے کے لیے یہ بات کافی تھی کہ ہم اس فرض کی اہمیت کو پوری طرح واضح کر کے ان کے سامنے رکھ دیں۔ یہ کام ہم نے کر دیا۔ اور اس کے بعد ہم دو ہی باتوں کے ان سے متوقع ہو سکتے تھے۔ یا تو اس بات کے کہ وہ اس فرض کی اہمیت کو سمجھ کر اس کے لیے اپنی توجہ اور سرگرمی کا وہ حصہ مخصوص کریں گے جس کا وہ مستحق ہے یا اگر وہ ہماری بات میں کوئی غلطی محسوس کریں گے تو اس سے متنبہ کریں گے۔ یہ تو کسی کو گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ حضرات ہماری بات کی تصدیق بھی کریں گے اور اس سے بیزار بھی رہیں گے اور اس بیزاری کی وجہ یہ ہوگی کہ ہم نے ان میں سے ہر ایک کی خدمت میں حاضر ہو کر ان سے اس دعوت کی سرپرستی کے لیے درخواست کیوں نہیں کی۔

جہاں مشترک مقصد کا سوال ہو وہاں اس طرح کی ذہنیت کا پیدا ہونا تعجب انگیز بھی ہے اور مایوس کن بھی اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جس گروہ کو وقت کی اسلامی سوسائٹی کا مکھن قرار دیا جاسکتا ہے اس کے فکر و عمل کا اسلامی روح کے لحاظ سے کیا حال ہے! یہ کوئی ہماری اپنی ذاتی تقریب نہیں تھی کہ اس کی شرکت کے لیے ہم ایک ایک کو بلاوا بھیجتے تب ہی لوگ اس میں شریک ہوتے۔ نہ ہم نے لڑکے کا ولیمہ کیا ہے نہ لڑکی کا نکاح کہ جن اصحاب کو دعوت دی گئی ہے وہ تو شریک ہوں اور جن کو دعوت نہیں دی گئی ہے وہ روٹھ کے بیٹھ رہیں اور اس وقت تک روٹھے رہیں جب تک برادری کے رسم کے مطابق ہم اس جرم کی تلافی نہ کر دیں۔ اجتماعی اور مشترک مقاصد کے لیے ہر اس جماعت کو حق ہے کہ وہ دعوت دے اور ہر وہ شخص جس میں اس اجتماعی مقصد کی اہمیت کا احساس ہے اس کا حق ہے کہ اس دعوت پر لبیک کہے۔ نہ اس طرح کے مقاصد کے لیے دعوت دینا کسی خاص گروہ کا حق ہے اور نہ اس طرح کی دعوتوں کو قبول کرنے میں کسی کے لیے کوئی پہلو شرم اور ذلت کا ہے۔

ایک مؤذن اذان دیتا ہے اور محلہ کے وہ سارے مسلمان اس کی صدا سنتے حی علی الصلوٰۃ پر جمع ہو جاتے ہیں جو نماز کے اوقات، اس کی فرضیت، اس کی اقامت اور جماعتی صورت میں اس کی اہمیت سے اچھی طرح واقف ہیں۔ اذان کی صدا کے بعد نہ مؤذن کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ دروازہ دروازہ لوگوں کو جگاتا پھرے اور نہ نمازیوں ہی کے لیے یہ زیبا ہے کہ حی علی الصلوٰۃ کی پکار سننے کے بعد وہ اس سے اس بات کے متوقع ہوں کہ وہ ان کو جگائے گا بھی، ان کے لیے وضو کا پانی بھی رکھے گا، ان کی مسواک اور ان کی تسبیح بھی تلاش کر کے لائے گا اور ان کی جانماز بھی بچھائے گا۔ یہ سارے کام داعی اور مؤذن کے کرنے کے نہیں ہیں بلکہ ان لوگوں کے خود کرنے کے ہیں جو نماز کی فرضیت اور دین میں اس کی اہمیت کو جانتے ہیں۔ یہ سارے جتن ایک داعی اگر کرتا بھی ہے تو ان لوگوں کے لیے نہیں، جو نماز کی قدر و قیمت پہچانتے ہیں بلکہ ان لوگوں کے لیے کرتا ہے جو نماز کے فوائد و برکات سے ناآشنا ہیں، اور صرف اس بات کے محتاج نہیں ہیں کہ ان کو ادائے فرض کے وقت سے

آگاہ کر دیا جائے بلکہ ساتھ ہی اس بات کے بھی محتاج ہیں کہ ان کو بچوں کی طرح اس فرض کی طرف پیار اور محبت سے لایا بھی جائے۔

ہم نے ان مذہبی بزرگوں کو اب تک نہ بچوں اور غافلوں کے درجہ میں رکھا ہے اور نہ منکرین اور مخالفین کے درجہ میں اس وجہ سے ان کے بارہ میں ہماری روش یہی رہی ہے کہ ہم اذان دے کر، جہاں تک ان کا تعلق ہے، اپنی ذمہ داری سے اپنے تئیں سبکدوش سمجھتے رہے ہیں اور ان کی طرف سے ان کے شایان شان جواب کے منتظر رہے ہیں لیکن اب جبکہ ہمارے باخبر احباب و مخلصین ہم کو بتاتے ہیں کہ ہماری طرف سے اسی قدر کافی نہیں ہے کہ ہم ان کو فرض سے آگاہ کر دیں بلکہ اس کے ماسوا اس بات کی بھی ضرورت ہے کہ استمالت اور نجاجت سے ان حضرات کو اس فرض کی طرف لائیں بھی تو ہم یہ واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ہم یہ سب کچھ بھی کر دیکھیں گے۔ اس میں ہمارے لیے کوئی شرم اور ذلت کی بات نہیں ہے بلکہ خود ان حضرات ہی کی دینداری اور خدا ترسی کی تحقیر ہے جو خدا کا فرض بھی اس وقت تک ادا کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار نہیں کر سکتے جب تک ہم سے اپنے نفس کا حق وصول نہ کر لیں۔ ہم تو خدا کے دین کے داعی ہیں اور اس کام کو اسی طریق پر انجام دینا چاہتے ہیں جس طریق پر خدا کے ان بندوں نے اس کو انجام دیا ہے جن کو خدا نے اس کام پر مامور کیا تھا۔ ہم اچھی طرح آگاہ ہیں کہ اس راہ میں سب سے پہلی چیز نفس کی انانیتوں کی قربانی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہم اس علم کے باوجود انانیت اور کبر نفس کا کوئی شائبہ لیے ہوئے اس میدان میں اتر آئے ہوں اس وجہ سے ہمارا ان سے زیادہ خیرخواہ کوئی نہیں ہو سکتا جن کا طرز عمل ہمیں نجاست سے پاک ہونے پر مجبور کر دے۔ البتہ وہ لوگ خود اپنے لیے فیصلہ کر لیں کہ ان کے لیے بہتر کیا ہے کیا یہ کہ ہم ان کی جوتیاں سیدھی کر کے ان کے نفس کی خواہش پوری کر دیں اور ان پر حق کی حجت تمام کر دیں یا یہ کہ وہ بغیر کسی ابار کے حق کا مطالبہ پورا کر دیں اور اپنے علم و تقویٰ کی لاج رکھ لیں؟

مقالات

دعوت حق کے مراحل

(۳)

تیسرا مرحلہ ـــــ جنگ

دعوتِ حق کے سلسلہ میں جنگ کی نوبت اس وقت آتی ہے جب تبلیغ اور شہادت علی الناس اور ہجرت کے مرحلے گزر چکتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی جنگ کے لیے چند ضروری شرطیں ہیں، جب تک یہ شرطیں پوری نہ ہوں اہل حق کے لیے تلوار اٹھانا اور زمین میں خونریزی کرنا جائز نہیں ہے۔ اور اگر وہ جلد بازی سے ایسا کر بیٹھیں تو ان کا یہ فعل ایک مفسدانہ فعل ہوگا جس پر اللہ تعالیٰ کے ہاں اجر و ثواب پانا تو الگ رہا الٹے اندیشہ اس بات کا ہے کہ ان سے مواخذہ ہو جائے اور وہ فساد فی الارض کے مجرم قرار پائیں۔

یہ شرطیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ پہلی شرط یہ ہے کہ جن لوگوں کے خلاف اعلان جنگ کیا جائے ان پر پہلے پوری طرح حق کی تبلیغ کر دی جائے۔ اس تبلیغ کے بغیر کسی قوم کے خلاف اعلان جنگ ناجائز ہے۔ اس کلیہ سے صرف وہ جنگ مستثنیٰ ہے جو مدافعت و حفاظت میں ہو۔ دفاعی جنگ، ہر حالت میں لڑی جا سکتی ہے۔ افراد بھی لڑ سکتے ہیں اور جماعتیں بھی لڑ سکتی ہیں۔ یہ جنگ تبلیغ کی شرط کے ساتھ مشروط نہیں ہے۔ جب بھی کسی کے جان و مال و آبرو پر کوئی حملہ ہو اس کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنی حفاظت میں جو قوت بھی اس کے پاس بروقت بہم ہو اس کو استعمال کرے۔ اس میں اگر وہ مارا جائے گا تو اس کو شہادت حاصل ہوگی، اور اگر حملہ آور حریف مارا جائے گا تو اس پر دوہرا گناہ ہوگا۔ ایک اس بات کا کہ اس نے اپنی جان ایک معصیت اور حق تلفی کی

دنیا میں ہلاک کی۔ دوسرا اس بات کا کہ اس نے ایک صاحب حق کی تلوار خون سے آلودہ کرائی۔ باقی رہی جارحانہ جنگ تو وہ اس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک متقدم الذکر شرط تبلیغ پوری نہ ہولے۔ لیکن اس تبلیغ کی دو صورتیں ہیں اور ان دونوں صورتوں میں جنگ کے احکام کی نوعیت کچھ مختلف ہو جاتی ہے۔

الف۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ یہ تبلیغ نبی کے ذریعہ سے ہو۔ نبی۔ تبلیغ اور اتمام حجت کا کامل ذریعہ ہے۔ اس کے ذریعہ سے اتمام حجت کی تمام شرطیں کمال درجہ پوری ہو جاتی ہیں۔ اس عالم اسباب میں عقل انسانی کو مطمئن کرنے کے لیے جو کچھ ممکن ہے وہ بہتر سے بہتر طریق پر ایک نبی پورا کر دیتا ہے اور اس غرض کے لیے اللہ تعالیٰ اس کو تمام اسباب و وسائل سے مسلح کر کے بھیجتا ہے۔ وہ قوم کے اندر کا بہترین شخص ہوتا ہے اعلیٰ ترین حسب و نسب کے ساتھ اٹھتا ہے۔ وہ نبوت سے پہلے بھی اور نبوت کے بعد بھی پاکیزہ ترین اخلاق کا مظاہرہ کرتا ہے۔ جھوٹ، بہتان، مکاری، بد معاملگی، ادعائے برتری اور خواہش نفوس کی آلودگیوں سے اس کا دامن بالکل پاک ہوتا ہے اور اس کی اس خوبی کی شہادت جس طرح اس کے دوست دیتے ہیں اسی طرح اس کے دشمنوں کو بھی اس کے ان فضائل سے انکار کی مجال نہیں ہوتی۔ وہ بہترین عام فہم زبان میں اپنی دعوت پیش کرتا ہے اور اس دعوت کو قوم کے بچہ بچہ تک پہنچا دینے کے لیے اپنے رات دن ایک کر دیتا ہے۔ اس کی تعلیم عقل و استدلال کے اعتبار سے اتنی محکم اور مضبوط ہوتی ہے کہ مخالفین سے اس کا جواب بن نہیں آتا۔ اس کے فیض تعلیم و صحبت سے لوگوں کی زندگیاں یکسر بدل جاتی ہیں ــــ ظالم اور مفسد حق شناس اور عدل پسند ہو جاتے ہیں، ڈاکو اور رہزن نیکوکار و امن پسند ہو جاتے ہیں، زانی اور بدمعاش عفیف اور پاکدامن بن جاتے ہیں، شرابی اور جواری پاکیزہ اخلاق اور خدا ترس ہو جاتے ہیں ــــ وہ جو کچھ کہتا ہے پہلے اس کو خود کر کے دکھاتا ہے اور جس قانون و نظام کا داعی ہوتا ہے اس کا سب سے زیادہ پابند و مطیع وہ خود ہوتا ہے۔ وہ اپنی دعوت کی حقیقت کا اپنے ساتھیوں کی زندگی میں بھی مظاہرہ کراتا ہے۔ وہ لوگوں کے مطالبہ پر معجزے بھی دکھاتا ہے۔ ان تمام وجوہ سے ایک نبی کی تبلیغ اتمام حجت کا آخری ذریعہ ہے اور جب کسی قوم پر نبی کے ذریعہ سے اتمام حجت ہو چکتا ہے۔

تو اللہ تعالیٰ اس کے بعد کسی قوم کے منکرین حق کو جینے کی مہلت نہیں دیتا۔ بلکہ لازمی طور پر دو باتوں میں سے کوئی نہ کوئی بات ہو کے رہتی ہے۔ اگر حق کو قبول کرنے والے تعداد میں تھوڑے سے ہوتے ہیں اور قوم کا بڑا حصہ منکر و مخالف رہ جاتا ہے تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو الگ کر لیتا ہے اور منکرین و مخالفین کو کوئی ارضی و سماوی عذاب بھیج کر فنا کر دیتا ہے۔ حضرت نوح، حضرت صالح، حضرت شعیب علیہم السلام وغیرہ کی قوموں کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا۔ اور اگر منکرین کی طرح مومنین کی تعداد بھی چند بہ اور معقول ہوتی ہے تو اس صورت میں اہل ایمان کو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ وہ منکرین کے خلاف اعلان جنگ کریں اور یہ جنگ اس وقت تک جاری رکھیں جب تک یا منکرین توبہ کر کے خدا کے دین کو قبول نہ کر لیں یا ان کی نجاست سے خدا کی زمین پاک نہ ہو جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اتمام حجت کے بعد بنی اسمٰعیل کے خلاف اسی قسم کی جنگ کے اعلان کا حکم دیا گیا۔

یہ قانون جس اصل پر مبنی ہے وہ یہ ہے کہ خدا کے انبیاء اس کے قانون عدالت کے مظہر ہوتے ہیں۔ وہ زمین میں خدا کی عدالت بن کر آتے ہیں۔ اور ان کی بعثت کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ حق و باطل میں فیصلہ ہو جائے۔ اہل حق کامیاب و فائز المرام ہوں اور اہل باطل ناکام و نامراد ہوں۔ اور چونکہ اس طرح کی جزاء و سزا کے لیے ضروری ہے کہ سزا پانے والوں پر خدا کی حجت پوری طرح تمام کر دی جائے اس وجہ سے انبیاء کرام اتمام حجت کے تمام شرائط کے ساتھ بھیجے جاتے ہیں۔ یہ شرطیں جب پوری ہو جاتی ہیں تو خدا کا قانون ان لوگوں کو جینے کی مہلت نہیں دیتا جو زبردستی ہٹ دھرمی کی وجہ سے حق کا انکار کرتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ سزا چونکہ اس اتمام حجت کے بعد دی جاتی ہے جس کے بعد اس دنیا میں اتمام حجت کا کوئی اور درجہ باقی نہیں رہ جاتا اس وجہ سے اس کو جبر و اکراہ نہیں قرار دیا جا سکتا بلکہ یہ عدل و انصاف کا عین مقتضیٰ ہے۔ انبیاء کے ذریعہ سے اتمام حجت ہو چکنے کے بعد بھی جو لوگ اللہ کے دین کو قبول نہیں کرتے ان کے لیے اگر کوئی اور چیز باقی رہ جاتی ہے تو وہ یہ کہ غیب کے پردے اٹھا دیے جائیں اور ان کو تمام حقائق کا آنکھوں سے مشاہدہ کرا دیا جائے لیکن اس طرح کا کشف حجاب اللہ تعالیٰ کی اس سنت کے خلاف ہے جو اس دنیا میں جاری ہے۔ اس دنیا میں

ہم سے ایمان و اسلام کا مطالبہ عقل و استدلال کی بنا پر کیا گیا ہے نہ کہ مشاہدہ اور معائنہ کی بنا پر۔ اس لیے عقل و استدلال کے لیے جو کچھ مطلوب ہے جب انبیاء کے واسطہ سے وہ مل چکتا ہے تو اس کے بعد مہلت ملنے کے کوئی معنی نہیں۔ اور اس کے بعد مزید بینات کا بھی کوئی پہلو نہیں ہے۔

ب۔ دوسری صورت یہ ہے کہ یہ تبلیغ صالحین امت کے ذریعہ سے ہو۔ صالحین کے ذریعہ سے اس درجہ کا اتمام حجت ممکن نہیں ہے جس درجہ کا اتمام حجت انبیاء کے ذریعہ سے ممکن ہے۔ نہ یہ ان اسباب و وسائل ہی سے پوری طرح بہرہ مند ہوتے جو انبیاء کے پاس ہوتے ہیں۔ اور نہ ان کی ذہنی اور قلبی صلاحیتیں ہی وہ ہو سکتی ہیں جو حضرات انبیائے کرام کی خصوصیات میں سے ہیں۔ علاوہ ازیں ان کا شبہات اور بدگمانیوں سے اس درجہ بالاتر ہونا بھی ناممکن ہے جس درجہ انبیائے معصوم ان چیزوں سے بالاتر ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ منکرین حق کے خلاف جو جنگ کرتے ہیں اس کی غایت صرف عدل اور امن کا قیام ہے۔ ان کو صرف یہ حق حاصل ہے کہ جو لوگ خدا کے دین کو قبول نہ کریں ان سے جنگ کر کے اس سیاسی طاقت کو چھین لیں جو ان کی بادشاہیوں کو دوسرے بندگان خدا تک متعدی ہو سکتی ہے اور جتنے سے ان کا یہ مقصد پورا ہو جائے اسی حد پر ان کو رک جانا چاہیے۔ اس حد سے آگے بڑھنے کی ان کو اجازت نہیں ہے۔ اگر اس حد معین سے ایک قدم بھی وہ تجاوز کر جائیں تو اس پر خدا کے ہاں وہ بازپرس کے مستحق ہوں گے۔ اسی طرح کی جنگیں ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ کے زمانہ میں صحابہ نے اپنی مخالفین سے۔ تو ان کے سامنے تین متبادل چیزیں پیش کرتے تھے۔ ایک یہ کہ اسلام لاؤ اور اسلام لا کر ہر چیز میں ہمارے برابر کے شریک و سہیم بن جاؤ۔ دوسری یہ کہ اسلامی حکومت کی رعایا بن جاؤ اور ایک متعین ٹیکس ادا کر کے اپنے پرسنل لا کے ساتھ امن سے رہو اور ہمارے نظم کی اطاعت کرو۔ تیسری یہ کہ ہمارے اعلان جنگ کو قبول کرو۔ اس صورت میں اگرچہ یہ گمان ہوتا ہے کہ صحابہ کی یہ تبلیغ نہایت اجمالی تھی اور وہ اس تفصیل و وضاحت کے ساتھ دین حق کو لوگوں کے سامنے نہیں پیش کرتے تھے جس تفصیل و وضاحت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش کیا تھا یا جس تفصیل و وضاحت کے ساتھ اس کو اچھی طرح دل نشین کرنے کے لیے پیش کرنا ضروری ہے لیکن یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ اصل یہ ہے

کہ صحابہ کے زمانہ میں ایک نظامِ حق عملاً قائم ہو چکا تھا جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ دعوت میں موجود نہیں تھا اس وجہ سے صحابہ اسلام کی تفہیم کے لیے کسی تفصیلی تبلیغ سے مستغنی تھے۔ ان کا قائم شدہ نظامِ حق خود اس حقیقت کے اظہار کے لیے کافی تھا کہ اسلام کیا ہے اور وہ بندگانِ خدا سے ان کی انفرادی و اجتماعی زندگیوں میں کن باتوں کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس عملی نظام کی وجہ سے ہر حقیقت ان کے زمانہ میں نمایاں اور ہر بات واضح تھی۔ عقیدہ ہو یا عمل، معاشرت ہو یا سیاست ہر چیز ایک مکمل حیاتِ اجتماعی کے پیکر میں دنیا کی نگاہوں کے سامنے موجود تھی اور ہر شخص اس کو آنکھوں سے دیکھ کر یہ معلوم کر سکتا تھا کہ اسلام کا ظاہر و باطن کیا ہے اور وہ کن اعتبارات سے دنیا کے تمام نظاموں پر فوقیت رکھتا ہے اور کیوں اسی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ باقی رہے اور اس کے سوا دنیا کے سارے نظام مٹ جائیں۔ اس طرح کا نظام جب بھی دنیا میں قائم و موجود ہو تو وہ اہلِ حق کو تفصیلی دعوت کی ضرورت سے بے نیاز کر دے گا اور مجرد اس کے قیام کی وجہ سے اہلِ حق کو یہ حق حاصل ہو گا کہ وہ لوگوں سے اس کی اطاعت کا مطالبہ کریں اور اگر لوگ اس مطالبہ سے انکار کریں تو وہ ان سے جنگ کر کے اس مطالبہ کو تسلیم کرنے پر مجبور کریں۔ اسلام نے عدم اتمامِ حجت کی شکل میں، جو غیر انبیاء کی دعوت میں متصور ہے، لوگوں کے اس انفرادی حق کو تو تسلیم کیا ہے کہ وہ جس عقیدہ پر چاہیں قائم رہیں لیکن وہ کسی گروہ کے لیے یہ حق تسلیم نہیں کرتا کہ وہ کسی غیر عادلانہ نظامِ حیات کو لوگوں پر بجبر مسلط کرے۔

۲۔ دوسری شرط یہ ہے کہ یہ جنگ مخلصین کے ذریعہ سے لڑی جائے کیونکہ اسلامی جہاد دنیا کو فساد سے پاک کرنے کے لیے ہے اس وجہ سے ان لوگوں کا جہاد کے لیے اٹھنا کوئی معنی نہیں رکھتا جو خود فساد سے آلودہ ہوں۔ یہ کام صرف انہی لوگوں کے کرنے کا ہے اور وہی لوگ اس کو کر سکتے ہیں جو سو فیصدی اس مقصد پر ایمان رکھتے ہوں جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے جہاد کا حکم دیا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے یہ بات جائز ہے کہ وہ تلوار اٹھائیں اور ان ہی لوگوں کی جنگ جہاد فی سبیل اللہ کے الفاظ سے تعبیر کی گئی ہے یہ لوگ اگر اس راہ میں مارے جائیں تو شہید ہوتے ہیں، اور اگر زندہ رہتے ہیں تو غازی اور مجاہد فی سبیل اللہ کے لقب کے مستحق ہیں۔ جو لوگ اس حق و عدل پر ایمان نہ رکھتے ہوں جس کے قیام کیلیے

جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ ان کو اسلام ہرگز یہ حق نہیں دیتا کہ وہ کسی ایک متنفس کا بھی خون بہائیں اور اگر وہ بہائیں گے تو ان کا یہ فعل ایک مفسدانہ فعل ہوگا اور اس پر ان سے مواخذہ ہوگا۔ اسلامی فوج کرایہ کے آدمیوں سے نہیں بنتی بلکہ وہ ایسے لوگوں سے مرکب ہوتی ہے جو اسلام پر اعتقاد رکھتے ہیں اور اسی کی خاطر لڑتے مرتے ہیں۔ اسلامی نظام کی یہ عین فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ صرف اپنے معتقدین ہی کے ذریعہ سے برپا ہو اور وہی لوگ اس کے برپا کرنے میں ساعی ہوں جو یہ سعی محض رضائے الٰہی کے حصول اور اقامت حق کی خاطر کریں نہ کسی دنیوی مفاد کی خاطر۔ اگر ان کی سعی میں حصول رضائے الٰہی اور اقامت حق کے پاک جذبے کے سوا کوئی اور جذبہ شامل ہو جائے تو صرف یہ کہ ان کی اس سعی کی اسلام کی نظر میں کوئی قیمت نہیں ہے بلکہ جو خون بھی اس سلسلہ میں انھوں نے بہایا ہے اس کا وبال ان کی گردن پر ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرات انبیائے کرام نے جہاد کے اعلان سے پہلے اس فرض کے لیے صالحین کی جماعت بنائی۔ کرایہ کے آدمیوں کی کوئی فوج نہیں مرتب کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے غزوات کے سلسلہ میں بعض ایسے مواقع بھی پیش آئے کہ ایسے لوگوں نے آپ کی حمایت میں لڑنے کے لیے اپنی خدمات پیش کیں جو اسلام پر عقیدہ نہیں رکھتے تھے، آپ نے ان کی پیشکش قبول نہیں فرمائی اور صاف فرما دیا کہ ہم اس کام میں ان لوگوں کی مدد حاصل نہیں کر سکتے جو اس مقصد پر ایمان نہ رکھتے ہوں جس مقصد کے لیے یہ لڑائی لڑی جا رہی ہے۔ حضرت موسیٰ، حضرت داؤد، حضرت سلیمان علیہم السلام نے جو غزوات کیے وہ بھی تمام تر مومنین صالحین کے ذریعہ سے کیے۔

یہی بات صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی ثابت ہے کہ ان کے زمانوں میں بھی جتنے غزوات ہوئے سب انھی لوگوں کے ذریعہ ہوئے جو اعتقاداً و عملاً اس چیز کو تسلیم کرتے تھے جس کو برپا کرنے کے لیے انھوں نے تلوار اٹھائی تھی۔ اور باوجودیکہ ان کے اثرات بہت وسیع تھے اور وہ چاہتے تو آسانی سے کرایہ کی فوج جمع کر لیتے لیکن نہ صرف یہ کہ انھوں نے کرایہ کی کوئی فوج نہیں بھرتی کی بلکہ خود اپنی بھی کوئی تنخواہ دار مستقل فوج نہیں قائم کی۔ جب جنگ کی ضرورت پیش آجاتی ہر شخص خود اپنا توشہ اور

اپنی سواری لے کر نکلتا اور محض اقامت دین کی خاطر جہاد کرتا اور احتیاط اور تقویٰ کی یہ شان تھی کہ عین اس وقت جب کہ دشمن سے ردوبدل ہو رہی ہوتی اگر کسی کے دل میں یہ خطرہ بھی گزر جاتا کہ اس وقت حصول رضائے الٰہی کے جذبہ کے سوا کسی اور نفسانی جذبہ سے وہ مغلوب ہو گیا ہے تو فوراً اپنی کھنچی ہوئی تلوار میان میں کر لیتا کہیں جہاد کسی انسان کا خون نفس کو خوش کرنے کے لیے نہ ہو جائے۔

۳۔ تیسری شرط یہ ہے کہ یہ جنگ ایک با اختیار و با اقتدار امیر کی قیادت و امارت میں لڑی جائے۔ با اختیار و با اقتدار امیر سے مطلب یہ ہے کہ اس کا اقتدار اپنی جماعت پر بزور قوت قائم ہو۔ وہ لوگوں پر شریعت کے احکام نافذ کر کے اس کی اطاعت پر لوگوں کو مجبور کر سکتا ہو اور خدا کے سوا کسی اور بالاتر اقتدار کا وہ محکوم نہ ہو۔ اس شرط کا سب سے زیادہ واضح ثبوت یہ ہے کہ انبیاء کرام میں سے کسی نے بھی اس وقت تک جہاد کا اعلان نہیں کیا جب تک انھوں نے ہجرت کر کے اپنی جماعت کو کسی آزاد علاقہ میں منظم نہیں کر لیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی سے بھی اس چیز کا ثبوت ملتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی سے بھی اس کی شہادت ملتی ہے۔ بعد کے زمانوں میں بھی جن لوگوں نے انبیاء کے طریقہ پر یہ فرض انجام دینے کی کوشش کی ـــــ مثلاً حضرت سید احمد شہید اور مولانا اسمٰعیل شہید ـــــ انھوں نے بھی اس امر کو پیش نظر رکھا اور ایک آزاد علاقہ میں پہنچ کر پہلے اپنی ایک با اختیار امارت بھی قائم کی اور اپنی جماعت کی تنظیم کر کے اس کے اندر شریعت کے تمام احکام و قوانین کا نفاذ بھی کیا۔

اس شرط کی دو وجہیں ہیں:

الف۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی باطل نظام کے اختلال و انتشار کو بھی اس وقت تک پسند نہیں کرتا جب تک اس بات کا امکان نہ ہو کہ جو لوگ اس باطل نظام کو مختل کر رہے ہیں وہ اس کی جگہ پر کوئی نظام حق قائم بھی کر سکیں گے۔ انارکی اور بے نظمی کی حالت ایک غیر فطری حالت ہے بلکہ انسانی فطرت سے یہ اس قدر بعید ہے کہ ایک غیر عادلانہ نظام بھی اس کے مقابل میں قابل ترجیح ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے کسی ایسی جماعت کو جنگ چھیڑنے کا اختیار نہیں

دیا ہے جو بالکل مبہم اور مجہول ہو جس کی قوت و استطاعت غیر معلوم اور مشتبہ ہو جس پر کسی ایک با اختیار امیر کا اقتدار قائم نہ ہو جس کی اطاعت و وفاداری کا امتحان نہ ہوا ہو جس کے افراد منتشر اور پراگندہ ہوں، جو کسی نظام کو درہم برہم تو کر سکتے ہوں لیکن اس امر کا کوئی ثبوت انھوں نے بہم نہ پہنچایا ہو کہ وہ کسی انتشار کو مجتمع بھی کر سکتے ہیں۔ یہ اعتماد صرف ایک ایسی جماعت ہی پر کیا جا سکتا ہے جس نے بالفعل ایک سیاسی جماعت کی صورت اختیار کر لی ہو اور جو اپنے دائرے کے اندر ایک ایسا ضبط و نظم رکھتی ہو کہ اس پر "الجماعت" کا اطلاق ہو سکے۔ اس حیثیت کے حاصل ہونے سے پہلے کسی جماعت کو یہ حق تو حاصل ہے کہ وہ "الجماعت" بننے کے لیے جدوجہد کرے اور اس کی یہ جدوجہد جہاد ہی کے حکم میں ہوگی لیکن اس کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ عملاً جہاد بالسیف اور قتال کے لیے اقدام شروع کر دے۔

ب۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ کسی جنگ کرنے والی جماعت کو انسانوں کے جان و مال پر جو اختیار حاصل ہو جاتا ہے وہ ایسا غیر معمولی اور اہم ہے کہ کوئی ایسی جماعت اس کو سنبھال ہی نہیں سکتی جس کے لیڈر کا اقتدار اس کے اوپر محض اخلاقی ہو۔ اخلاقی اقتدار اس امر کی کافی ضمانت نہیں ہے کہ وہ لوگوں کے فساد فی الارض کو روک سکے اس وجہ سے مجرد اخلاقی اقتدار کے اعتماد پر کسی اسلامی لیڈر کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے ماننے والوں کو تلوار اٹھانے کی اجازت دے دے ورنہ اس بات کا قوی اندیشہ ہے کہ جب ایک مرتبہ ان کی تلوار جھک جائے گی تو وہ حلال و حرام کے حدود کی پابند نہیں رہے گی اور ان کے ہاتھوں وہ سب کچھ ہو جائے گا جس کے مٹانے ہی کے لیے اس نے تلوار اٹھائی ہے۔ عام انقلابی جماعتیں جو مجرد ایک انقلاب برپا کرنا چاہتی ہیں اور جن کا مطمح نظر اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا کہ وہ قائم شدہ نظم کو درہم برہم کر کے برسر اقتدار پارٹی کے اقتدار کو مٹائیں اور اس کی جگہ اپنا اقتدار جمائیں اس قسم کی بازیاں کھیلتی ہیں اور کھیل سکتی ہیں ان کے نزدیک نہ کسی نظم کا اختلال کوئی حادثہ ہے نہ کسی ظلم کا ارتکاب کوئی معصیت۔ اس وجہ سے ان کے لیے سب کچھ مباح ہے۔ لیکن ایک عادل اور حق پسند جماعت کے لیڈروں کو لازماً یہ

دیکھنا پڑتا ہے کہ جس نظم سے وہ خدا کے بندوں کو محروم کر رہے ہیں اس سے بہتر نظم ان کے واسطے مہیا کرنے کی وہ صلاحیت رکھتے ہیں یا نہیں، اور جس ظلم کے مٹانے کے وہ درپے ہیں اس قسم کے مظالم سے اپنے آدمیوں کو بھی روکنے پر وہ پوری طرح قادر ہیں یا نہیں؟ اگر ایسا نہیں ہے تو ان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ محض اتفاقات کے اعتماد پر وہ لوگوں کے جان و مال کے ساتھ بازیاں کھیلیں، اور جس فساد کو مٹانے کے لیے اٹھے ہیں اس سے بڑا فساد خود برپا کرا دیں۔

۴۔ چوتھی شرط حصول قوت ہے لیکن صالحین کی جماعت کو اس کے لیے کوئی علیحدہ اہتمام کرنا نہیں پڑتا۔ اوپر جو تین شرطیں بیان ہوئی ہیں ان کو ٹھیک ٹھیک پورے کر دینے سے ضروری قوت خود بخود بہم ہو جاتی ہے۔ ایک صحیح دعوت ہر قوت و استعداد کے آدمیوں کو اپنے ارد گرد مجتمع کر لیتی ہے۔ ان کے واسطے سے سرمایہ بھی بہم ہو جاتا ہے اور ضروری وسائل کار یا ان کے پیدا کرنے کی قابلیتیں بھی فراہم ہو جاتی ہیں۔ پھر جب یہ جماعت کی شکل اختیار کرتے ہیں اور ایک آزاد ماحول میں اپنے آپ کو ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے ایک با اقتدار امیر کی اطاعت پر جمع کر لیتے ہیں تو ان کی اخلاقی اور معنوی قوت بھی دو چند ہو جاتی ہے اور مادی وسائل کے فراہم کرنے اور پیدا کرنے کے امکانات بھی وسیع تر ہو جاتے ہیں۔ پس جہاں تک حصول طاقت کی سعی کا تعلق ہے وہ فی الحقیقت ان شرائط کی تکمیل کے اندر ہی مضمر ہے۔ اس سے علیحدہ اس کے لیے کسی خاص مہم کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ تاہم جارحانہ جنگ کے لیے قوت کی فراہمی بھی ایک ضروری شرط ہے۔ اس کے بغیر کوئی جماعت جنگ کا اعلان کر دے تو وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کی مجرم ہوگی۔

ان تمام شرائط کی نوعیت پر غور کرنے کے بعد یہ حقیقت آپ سے آپ واضح ہو جاتی ہے کہ کسی دعوت حق کے سلسلہ میں جنگ کا مرحلہ شہادت علی الناس اور ہجرت کے مراحل کے بعد کیوں آتا ہے؟ درحقیقت ان دونوں مرحلوں سے گزرنے کے بعد ہی وہ لوگ متعین ہو کر سامنے آتے ہیں جن سے اسلام میں جنگ جائز ہے، اور ان مراحل سے گزر چکنے کے بعد ہی وہ جماعت بھی صحیح

معنوں میں وجود میں آتی ہے جس کو یہ حق حاصل ہوتا ہے کہ وہ تلوار کے زور سے امن و عدل قائم کرے۔ جو لوگ انبیاء کرام کی اس ترتیب کار سے واقف نہیں ہیں اور عام انقلابی جماعتوں کے طریق کار سے متاثر ہیں وہ اکثر ہم پر سست روی بلکہ بے عملی کا الزام لگاتے ہیں ان کو ان تمام مراحل کے فوائد اور نتائج پر غور کرنا چاہیے اور اس امر کو پیش نظر رکھنا چاہیے کہ ہم دنیا میں کوئی فساد برپا کرنے نہیں اٹھے ہیں بلکہ اصلاح کے ارادہ سے اٹھے ہیں۔

خریداران ترجمان القرآن سے التماس

۱۔ چندہ کے منی آرڈر کوپن پر اپنا پورا پتہ صاف اور خوشخط لکھیے (خصوصاً ڈاکخانہ اور ضلع کا نام انگریزی کے بڑے حروف میں درج کیجیے)۔ سابق نمبر خریداری بھی تحریر فرمایئے۔

۲۔ اگر کوئی اضطراری صورت حائل نہ ہو تو رسالہ ترجمان القرآن ہر انگریزی ماہ کی ۲۰ تاریخ کو باقاعدگی سے پوسٹ کیا جاتا ہے اور پوسٹ کرنے سے پہلے پوری ذمہ داری سے تمام پرچوں کی اور رجسٹر خریداری کے اندراج کی جانچ کرلی جاتی ہے۔ پس رسالہ نہ پہنچنے کی صورت میں اپنے ڈاک خانہ سے دریافت کیجیے۔ دفتر کسی خریدار کو دوبارہ کوئی پرچہ ۸ر کے ٹکٹ موصول ہوئے بغیر روانہ کرے گا۔

۳۔ وقتی طور پر اگر ایک دو ماہ کے لیے پتہ تبدیل کرانا ہو تو براہ کرم اپنے ڈاک خانہ کو تئے عارضی پتہ پر پرچہ Re-direct کرنے کی ہدایت کر دیا کیجیے اور مستقل طور پر پتہ بدلنا ہو تو رسالہ کے دفتر کو لکھیے۔ ورنہ بار بار اندراجات کو بدلنے سے دفتر باقاعدگی کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔ نیز تبدیلی پتہ کی فرمائش مہینے کی ۱۵ تاریخ تک دفتر کو پہنچ جانی چاہیے۔ جس میں پہلا پتہ اور نیا تبدیل شدہ پتہ دونوں نمبر خریداری کے حوالہ کے ساتھ درج ہوں۔ یہ بات بھی بہت ضروری ہے کہ پتہ صاف اور خوشخط لکھا جائے، خصوصاً ڈاک خانہ اور ضلع کا نام انگریزی کے بڑے حروف (Block leters) میں درج ہوں تو زیادہ سہولت ہوگی۔

۴۔ اجرائے رسالہ کے لیے پیشگی چندہ بھیجیے یا وی پی کی اجازت دیجیے، قرض یا وعدے پر رسالہ جاری نہیں کیا جاتا ہے۔

۵۔ رسالہ ترجمان القرآن کے معاملات میں مرکز جماعت اسلامی کے کسی دوسرے شعبے کو مخاطب نہ کیجیے اور نہ دوسرے شعبوں سے متعلقہ امور ہمارے دفتر کے معاملات میں خلط ملط کرکے لکھیے۔

اگر خدانخواستہ آپ ان گذارشات کو نظرانداز کریں گے تو دفتر کی مجبورانہ کوتاہیوں کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔

"مینیجر"

شہادتِ حق

امتِ مسلمہ کا فرض اور مقصدِ وجود

پچھلے دنوں بحالیٔ صحت کے لیے سیالکوٹ میں قیام کا اتفاق ہوا تھا۔ وہاں جماعت اسلامی کے ایک اجتماع میں یہ تقریر کی گئی، احباب کی خواہش پر اسے قلمبند کر کے شائع کیا جاتا ہے۔ تقریر کے آخری حصہ میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے وہ ان شبہات کے جواب میں ہے جو جماعت کے نظام اور طریق کار پر بعض مقامی حلقوں کی طرف سے پھیلائے جا رہے تھے۔

ساری تعریف اُس خدا کے لیے ہے جو کائنات کا تنہا خالق، مالک اور حاکم ہے، جو کمال درجہ کی حکمت، قدرت اور رحمت کے ساتھ اس میں فرمانروائی کر رہا ہے، جس نے انسان کو پیدا کیا، اس کو علم و عقل کی قوتیں بخشیں، اسے زمین میں اپنی خلافت سے سرفراز کیا اور اس کی رہنمائی کے لیے کتابیں اتاریں اور پیغمبر بھیجے۔ پھر خدا کی بے شمار رحمتیں ہوں اس کے اُن نیک اور برگزیدہ بندوں پر جو انسان کو انسانیت سکھانے آئے، جنھوں نے آدمی کو اُس کے مقصد زندگی سے خبردار کیا اور اسے دنیا میں جینے کا صحیح طریقہ بتایا۔ آج دنیا میں ہدایت کی روشنی، اخلاق کی پاکیزگی اور نیکی و پرہیزگاری جو کچھ بھی پائی جاتی ہے وہ سب خدا کے انہی برگزیدہ بندوں کی رہنمائی کی بدولت ہے اور انسان کبھی ان کے بارِ احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔

عزیزو اور دوستو! ہم اپنے اجتماعات کو دو حصوں میں تقسیم کیا کرتے ہیں۔ ایک حصہ اس غرض کے لیے ہوتا ہے کہ ہم خود آپس میں بیٹھ کر اپنے کام کا جائزہ لیں اور اسے آگے بڑھانے کے لیے باہم مشورہ کریں۔ دوسرا حصہ اس مقصد کے لیے خاص ہوتا ہے کہ جس مقام پر ہمارا اجتماع ہو وہاں کے عام باشندوں کے سامنے ہم اپنی دعوت کو پیش کریں۔ اس وقت کا یہ اجتماع اسی دوسری غرض

کے لیے ہے۔ ہم نے آپ کو اس لیے تکلیف دی ہے کہ آپ کو بتائیں کہ ہماری دعوت کیا ہے اور کس چیز کی طرف ہم بلاتے ہیں۔

ہماری دعوت کا خطاب ایک تو ان لوگوں سے ہے جو پہلے سے مسلمان ہیں۔ دوسرے اُن عام بندگان خدا سے جو مسلمان نہیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے ہمارے پاس ایک پیغام ہے۔ مگر افسوس ہے کہ یہاں دوسرے گروہ کے لوگ مجھے نظر نہیں آتے۔ یہ ہماری پچھلی غلطیوں اور آج کی بے تدبیریوں کا نتیجہ ہے کہ خدا کے بندوں کا ایک بہت بڑا حصہ ہم سے دور ہو گیا ہے اور مشکل ہی سے کبھی ہم یہ موقع پاتے ہیں کہ ان کو اپنے پاس بلا کر یا خود ان کے قریب جا کر وہ پیغام ان کو سنائیں جو ان کے اور ہمارے خدا نے ہم سب کی رہنمائی کے لیے اپنے پیغمبروں کے ذریعہ سے بھیجا ہے۔ بہرحال اب کہ وہ موجود نہیں ہیں، میں دعوت کے صرف اس حصہ کو پیش کروں گا جو مسلمانوں کے لیے خاص ہے۔

مسلمانوں کو ہم جس چیز کی طرف بلاتے ہیں وہ یہ ہے کہ وہ ان ذمہ داریوں کو سمجھیں اور ادا کریں جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان پر عائد ہوتی ہیں۔ آپ صرف اتنا کہہ کر نہیں چھوٹ سکتے کہ ہم مسلمان ہیں اور ہم نے خدا کو اور اس کے دین کو مان لیا۔ بلکہ جب آپ نے خدا کو اپنا خدا اور اس کے دین کو اپنا دین مانا ہے تو اس کے ساتھ آپ پر کچھ ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں جن کا آپ کو شعور ہونا چاہیے اور جن کے ادا کرنے کی آپ کو فکر ہونی چاہیے۔ اگر آپ انہیں ادا نہ کریں گے تو اس کے وبال سے نہ دنیا میں چھوٹ سکیں گے نہ آخرت میں۔ وہ ذمہ داریاں کیا ہیں؟ وہ صرف یہی نہیں ہیں کہ آپ خدا پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں پر، اس کے رسولوں پر اور یوم آخرت پر ایمان لائیں۔ وہ صرف اتنی بھی نہیں ہیں کہ آپ نماز پڑھیں، روزہ رکھیں، حج کریں اور زکوٰۃ دیں۔ وہ صرف اتنی بھی نہیں ہیں کہ آپ نکاح، طلاق، وراثت وغیرہ معاملات میں اسلام کے مقرر کیے ہوئے ضابطے پر عمل کریں بلکہ ان سب کے علاوہ ایک بڑی اور بہت بھاری ذمہ داری آپ پر یہ بھی عائد ہوتی ہے کہ آپ تمام دنیا کے سامنے اس حق کے گواہ بن کر کھڑے ہوں جس پر آپ ایمان لائے ہیں۔ "مسلمان" کے نام

سے آپ کو ایک مستقل امت بنانے کی واحد غرض جو قرآن میں بیان کی گئی ہے وہ یہی ہے کہ آپ تمام بندگان خدا پر شہادت حق کی حجت پوری کردیں: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔ یہ آپ کی امت کا عین مقصد وجود ہے جسے آپ نے پورا نہ کیا تو گویا اپنی زندگی ہی اکارت گنوادی۔ یہ آپ پر خدا کا عائد کیا ہوا فرض ہے کیونکہ خدا کا حکم یہ ہے کہ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ۔ "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، خدا کی خاطر اٹھنے والے اور ٹھیک ٹھیک راستی کی گواہی دینے والے بنو۔" اور یہ نرا حکم ہی نہیں بلکہ تاکیدی حکم ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ "اس شخص سے بڑھ کر ظالم اور کون ہوگا جس کے پاس اللہ کی طرف سے ایک گواہی ہو اور وہ اسے چھپائے۔" پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس فرض کو انجام نہ دینے کا نتیجہ کیا ہے۔ آپ سے پہلے اس گواہی کے کٹہرے میں یہودی کھڑے کیے گئے تھے مگر انہوں نے کچھ تو حق کو چھپایا اور کچھ حق کے خلاف گواہی دی اور فی الجملہ حق کے نہیں بلکہ باطل کے گواہ بن کر رہ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے انہیں دھتکار دیا اور ان پر وہ پھٹکار پڑی کہ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ۔

یہ شہادت جس کی ذمہ داری آپ پر ڈالی گئی ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ جو حق آپ کے پاس آیا ہے، جو صداقت آپ پر منکشف کی گئی ہے، انسان کے لیے فلاح و نجات کی ایک ہی راہ جو آپ کو دکھائی گئی ہے، آپ دنیا کے سامنے اس کے حق اور صداقت ہونے پر اور اس کے راہ راست ہونے پر گواہی دیں، ایسی گواہی جو اس کے حق اور راستی ہونے کو مبرہن کردے اور دنیا کے لوگوں پر دین کی حجت پوری کردے۔ اسی شہادت کے لیے انبیاء علیہم السلام دنیا میں بھیجے گئے تھے اور اس کا ادا کرنا ان پر فرض تھا۔ پھر یہی شہادت تمام انبیاء کے بعد ان کی امتوں پر فرض ہوتی رہی۔ اور اب خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد یہ فرض امت مسلمہ پر بحیثیت مجموعی اسی طرح عائد ہوتا ہے جس طرح حضورؐ پر آپ کی زندگی میں شخصی حیثیت سے عائد تھا۔

اس گواہی کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ نوعِ انسانی کے لیے اللہ تعالیٰ نے بازپرس اور جزا و سزا کا جو قانون مقرر کیا ہے اس کی ساری بنیاد ہی اس گواہی پر ہے۔ اللہ تعالیٰ حکیم و رحیم اور قائم بالقسط ہے۔ اس کی حکمت و رحمت اور اس کے انصاف سے یہ بعید ہے کہ لوگوں کو اس کی مرضی نہ معلوم ہو اور وہ انھیں اس بات پر پکڑے کہ وہ اس کی مرضی کے خلاف چلے۔ لوگ نہ جانتے ہوں کہ راہِ راست کیا ہے اور وہ ان کی کج روی پر ان سے مواخذہ کرے۔ لوگ اس سے بے خبر ہوں کہ ان سے کس چیز کی بازپرس ہونی ہے اور وہ انجانی چیز کی ان سے بازپرس کرے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے آفرینش کی ابتدا ہی ایک پیغمبر سے کی اور پھر وقتاً فوقتاً بے شمار پیغمبر بھیجے تاکہ وہ نوعِ انسانی کو خبردار کریں کہ تمھارے معاملہ میں تمھارے خالق کی مرضی یہ ہے۔ تمھارے لیے دنیا میں زندگی بسر کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے، یہ رویہ ہے جس سے تم اپنے مالک کی رضا کو پہنچ سکتے ہو، یہ کام ہیں جو تم کو کرنے چاہییں اور یہ کام ہیں جن سے تم کو بچنا چاہیے اور یہ امور ہیں جن کی تم سے بازپرس کی جائے گی۔ یہ شہادت جو اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبروں سے دلوائی اس کی غرض قرآن مجید میں صاف صاف یہی بتائی گئی ہے کہ لوگوں کو اللہ پر یہ حجت قائم کرنے کا موقع باقی نہ رہے کہ ہم بے خبر تھے اور آپ ہمیں اس چیز پر پکڑتے ہیں جس سے ہم کو خبردار نہ کیا گیا تھا۔ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی حجت اپنے اوپر سے اتار کر پیغمبروں پر ڈال دی اور پیغمبر اس اہم ذمہ داری کے منصب پر کھڑے کر دیے گئے کہ اگر وہ شہادتِ حق کا حق ٹھیک ٹھیک ادا کر دیں تو لوگ اپنے اعمال پر خود بازپرس کے مستحق ہوں اور اگر ان کی طرف سے ادائے شہادت میں کوتاہی ہو تو لوگوں کی گمراہی و کجروی کا مواخذہ پیغمبروں سے کیا جائے۔ دوسرے الفاظ میں پیغمبروں کے منصب کی نزاکت یہ تھی کہ یا تو وہ حق کی شہادت ٹھیک ٹھیک ادا کر کے لوگوں پر حجت قائم کریں ورنہ لوگوں کی حجت الٹی ان پر قائم ہوئی جاتی تھی کہ خدا نے حقیقت کا جو علم آپ حضرات کو دیا تھا وہ آپ نے ہمیں نہ پہنچایا اور جو صحیح طریقِ زندگی اس نے آپ کو بتایا تھا وہ آپ نے ہمیں نہ بتایا۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام اپنے اوپر اس ذمہ داری کے بار کو شدت

کے ساتھ محسوس کرتے تھے اور اسی بنا پر انھوں نے اپنی طرف سے حق کی شہادت ادا کرنے اور لوگوں پر حجت تمام کردینے کی جان توڑ کوشش کیں۔ پھر انبیاء کے ذریعہ سے جن لوگوں نے حق کا علم اور ہدایت کا راستہ پایا وہ ایک امت بنا دیے گئے اور وہی منصب شہادت کی نازک ذمہ داری، جس کا بار انبیاء پر ڈالا گیا تھا، اب اس امت کے حصہ میں آئی اور انبیاء کے قائم مقام ہونے کی حیثیت سے اس کا یہ مقام قرار پایا کہ اگر یہ ادائے شہادت کا حق ادا کردے اور لوگ درست نہ ہوں تو یہ اجر پائے گی اور لوگ پکڑے جائیں گے، اور اگر یہ حق کی شہادت دینے میں کوتاہی کرے یا حق کے بجائے الٹی باطل کی شہادت دینے لگے تو لوگوں سے پہلے یہ پکڑی جائے گی۔ اس سے خود اس کے اعمال کی بازپرس بھی ہوگی اور ان لوگوں کے اعمال کی بھی جو اس کے صحیح شہادت نہ دینے یا غلط شہادت دینے کی وجہ سے گمراہ اور مفسد اور غلط کار رہے۔

حضرات، یہ ہے شہادت حق کی وہ نازک ذمہ داری جو مجھ پر، آپ پر اور ان سب لوگوں پر عائد ہوتی ہے جو اپنے کو امت مسلمہ کہتے ہیں اور جن کے پاس خدا کی کتاب اور ان کے انبیاء کی ہدایت پہنچ چکی ہے۔ اب دیکھیے کہ اس شہادت کے ادا کرنے کا طریقہ کیا ہے۔ شہادتیں دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک قولی شہادت۔ دوسرے عملی شہادت۔ قولی شہادت کی صورت یہ ہے کہ ہم زبان اور قلم سے دنیا پر اس حق کو واضح کریں جو انبیاء کے ذریعہ سے ہمیں پہنچا ہے۔ سمجھانے اور دل نشین کرنے کے جتنے طریقے ممکن ہیں، ان سب سے کام لے کر، تبلیغ و دعوت اور نشر و اشاعت کے جتنے ذرائع ممکن ہیں ان سب کو استعمال کرکے، علوم و فنون نے جس قدر مواد فراہم کیا ہے وہ سب اپنے کام میں لے کر ہم دنیا کو اس دین کی تعلیم سے روشناس کریں جو خدا نے انسان کے لیے مقرر کیا ہے۔ فکر و اعتقاد میں، اخلاق و سیرت میں، تمدن و معاشرت میں، کسب معاش اور لین دین میں، قانون اور نظم عدالت میں، سیاست اور تدبیر مملکت میں، اور بین الانسانی معاملات کے تمام دوسرے پہلوؤں میں اس دین نے انسان کی رہنمائی کے لیے جو کچھ پیش کیا ہے اسے ہم خوب کھول کھول بیان کریں، دلائل اور شواہد سے اس کا حق ہونا ثابت کریں، اور جو کچھ اس کے خلاف ہے اس پر

معقول تنقید کر کے بتائیں کہ اس میں کیا خرابی ہے۔ اس قولی شہادت کا حق ادا نہیں ہو سکتا جب تک کہ امت مجموعی طور پر ہدایت خلق کے لیے اسی طرح فکرمند نہ ہو جس طرح انبیاء علیہم السلام انفرادی طور پر اس کے لیے فکرمند رہا کرتے تھے۔ یہ حق ادا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ یہ کام ہماری تمام اجتماعی کوششوں اور قومی سعی و جہد کا مرکزی نقطہ ہو، ہم اپنے دل و دماغ کی ساری قوتیں اور اپنے سارے وسائل و ذرائع اسی پر لگا دیں، ہمارے تمام کاموں میں یہ مقصد لازماً ملحوظ رہے، اور ہم اپنے درمیان سے کسی ایسی آواز کے اٹھنے کو تو کسی حال میں برداشت ہی نہ کریں جو حق کے خلاف شہادت دینے والی ہو۔

رہی عملی شہادت تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی زندگی میں اُن اصولوں کا عملاً مظاہرہ کریں جن کو ہم حق کہتے ہیں۔ دنیا صرف ہماری زبان ہی سے ان کی صداقت کا ذکر نہ سنے بلکہ خود اپنی آنکھوں سے خود ہماری زندگی میں ان کی خوبیوں اور برکتوں کا مشاہدہ کرلے۔ وہ ہمارے برتاؤ میں اُس شیرینی کا ذائقہ چکھ لے جو ایمان کی حلاوت سے انسان کے اخلاق و معاملات میں پیدا ہوتی ہے۔ وہ خود دیکھ لے کہ اس دین کی رہنمائی میں کیسے اچھے انسان بنتے ہیں، کیسی عادل سوسائٹی تیار ہوتی ہے، کیسی صالح معاشرت وجود میں آتی ہے، کس قدر ستھرا اور پاکیزہ تمدن پیدا ہوتا ہے، کیسے صحیح خطوط پر علوم و آداب اور فنون کا نشو و نما ہوتا ہے، کیسا منصفانہ، ہمدردانہ اور بے نزاع معاشی تعاون رونما ہوتا ہے، اور انفرادی و اجتماعی زندگی کا ہر پہلو کس طرح سدھر جاتا ہے، سنور جاتا ہے اور بھلائیوں سے مالا مال ہو جاتا ہے۔ اس شہادت کا حق صرف اسی طرح ادا ہو سکتا ہے کہ ہم فرداً فرداً بھی اور قومی حیثیت سے بھی اپنے دین کی حقانیت پر مجسم شہادت بن جائیں۔ ہمارے افراد کا کردار اس کی صداقت کا ثبوت دے، ہمارے گھر اس کی خوشبو سے مہکیں، ہماری دکانیں اور ہمارے کارخانے اس کی روشنی سے جگمگائیں، ہمارے ادارے اور ہمارے مدرسے اس کے نور سے منور ہوں، ہمارا لٹریچر اور ہماری صحافت اس کی خوبیوں کی سند پیش کرے، ہماری قومی پالیسی اور اجتماعی سعی و جہد اس کے برحق ہونے کی روشن دلیل ہو۔ غرض ہم سے جہاں اور جس حیثیت میں بھی کسی شخص یا قوم کو سابقہ پیش آئے وہ ہمارے شخصی اور قومی کردار میں اس بات کا ثبوت پالے کہ جن اصولوں کو ہم حق کہتے ہیں وہ واقعی حق ہیں، اور ان سے فی الواقع انسانی زندگی

اصلح اور اعلیٰ و ارفع ہوتی ہے۔ پھر یہ بھی عرض کردوں کہ اس شہادت کی تکمیل اگر ہوسکتی ہے تو صرف اس وقت جبکہ ایک اسٹیٹ انہی اصولوں پر قائم ہوجائے اور وہ پورے دین کو عمل میں لاکر اپنے عدل و انصاف سے، اپنے اصلاحی پروگرام سے، اپنے حسنِ انتظام سے، اپنے امن سے، اپنے باشندوں کی فلاح و بہبود سے، اپنے حکمرانوں کی نیک سیرت سے، اپنی صالح داخلی سیاست سے، اپنی راستبازانہ خارجی پالیسی سے، اپنی شریفانہ جنگ سے اور اپنی وفادارانہ صلح سے ساری دنیا کے سامنے اس بات کی شہادت دے کہ جس دین نے اس اسٹیٹ کو جنم دیا ہے وہ درحقیقت انسانی فلاح کا ضامن ہے اور اسی کی پیروی میں نوعِ انسانی کی بھلائی ہے۔ یہ شہادت جب قولی شہادت کے ساتھ مل جائے تب وہ ذمہ داری پوری طرح ادا ہوجاتی ہے جو امتِ مسلمہ پر ڈالی گئی ہے، تب نوعِ انسانی پر بالکل اتمامِ حجت ہوجاتا ہے، اور تب ہی ہماری امت اس قابل ہوسکتی ہے کہ آخرت کی عدالت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کھڑی ہوکر شہادت دے سکے کہ جو کچھ حضورؐ نے ہم کو پہنچایا تھا وہ ہم نے لوگوں تک پہنچا دیا اور اس پر بھی جو لوگ راہِ راست پر نہ آئے وہ اپنی کج روی کے خود ذمہ دار ہیں۔

حضرات! یہ تو وہ شہادت ہے جو مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمیں قول و عمل میں دینی چاہیے تھی۔ مگر اب دیکھیے کہ آج ہم فی الواقع کیا شہادت دے رہے ہیں۔ پہلے قولی شہادت کا جائزہ لیجیے۔ ہمارے اندر ایک بہت ہی قلیل گروہ ایسا ہے جو کہیں انفرادی طور پر اور کہیں اجتماعی طور پر زبان و قلم سے اسلام کی شہادت دیتا ہے، اور اس میں بھی ایسے لوگ شاید انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں جو اس شہادت کو اُس طرح ادا کررہے ہیں جیسا اس کے ادا کرنے کا حق ہے۔ اس گروہِ قلیل کو اگر آپ الگ کرلیں تو آپ دیکھیں گے کہ مسلمانوں کی عام شہادت اسلام کے حق میں نہیں بلکہ اس کے خلاف جاری ہے۔ ہمارے زمیندار شہادت دے رہے ہیں کہ اسلام کا قانونِ وراثت غلط ہے اور جاہلیت کے رواج صحیح ہیں۔ ہمارے وکیل اور جج اور مجسٹریٹ شہادت دے رہے ہیں کہ اسلام کے سارے ہی قوانین غلط ہیں بلکہ اسلامی قانون کا بنیادی نظریہ ہی قابلِ قبول نہیں ہے اور صحیح صرف وہ قوانین ہیں جو انسانوں نے وضع کیے ہیں۔ ہمارے معلم اور پروفیسر اور تعلیمی ادارے شہادت دے رہے ہیں کہ فلسفہ و حکمت، تاریخ و

اجتماعیات، معاشیات و سیاسیات اور قانون و اخلاق کے متعلق وہی نظریات برحق ہیں جو مغرب کی ملحدانہ تعلیم سے ماخوذ ہیں اور ان امور میں اسلام کا نقطۂ نظر قابل التفات تک نہیں ہے۔ ہمارے ادیب شہادت دے رہے ہیں کہ ان کے پاس بھی ادب کا وہی پیغام ہے جو انگلستان، فرانس، اور روس کے دہری ادیبوں کے پاس ہے اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان کے ادب کی کوئی حقیقی روح نہیں ہے۔ ہمارا پریس شہادت دے رہا ہے کہ اس کے پاس بھی وہی مباحث اور مسائل اور پروپیگنڈا کے وہی انداز ہیں جو غیر مسلموں کے پاس ہیں۔ ہمارے تاجر اور اہل صنعت شہادت دے رہے ہیں کہ اسلام نے لین دین پر جو حدود قائم کیے ہیں وہ ناقابل عمل ہیں اور کاروبار صرف انہی طریقوں پر ہو سکتا ہے جن پر کفار عامل ہیں۔ ہمارے لیڈر شہادت دے رہے ہیں کہ ان کے پاس بھی قومیت اور وطنیت کے وہی نعرے ہیں، وہی قومی مطالبے ہیں، قومی مسائل کو حل کرنے کے وہی ڈھنگ ہیں، سیاست اور دستور کے وہی اصول ہیں جو کفار کے پاس ہیں اور اسلام نے اس بارے میں کوئی رہنمائی نہیں کی ہے۔ ہمارے عوام شہادت دے رہے ہیں کہ ان کے پاس زبان کا کوئی مصرف دنیا اور اس کے معاملات کے سوا نہیں ہے اور وہ کوئی ایسا دین رکھتے ہی نہیں جس کا وہ چرچا کریں یا جس کی باتوں میں وہ اپنا کچھ وقت صرف کریں۔ یہ ہے وہ قولی شہادت جو مجموعی طور پر ہماری پوری امت ہندوستان ہی میں نہیں، ساری دنیا میں دے رہی ہے۔

اب عملی شہادت کی طرف آئیے۔ اس کا حال قولی شہادت سے بھی بدتر ہے۔ بلاشبہ کہیں کہیں کچھ صالح افراد ہمارے اندر ایسے پائے جاتے ہیں جو اپنی زندگی میں اسلام کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ مگر سواد اعظم کا حال کیا ہے؟ انفرادی طور پر عام مسلمان اپنے عمل میں اسلام کی جو نمائندگی کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ اسلام کے زیر اثر پرورش پانے والے افراد کسی حیثیت سے بھی کفر کے زیر سایہ پلے ہوئے افراد سے بلند یا مختلف نہیں ہیں بلکہ بہت سی حیثیتوں سے ان کی بہ نسبت فروتر ہیں۔ وہ جھوٹ بول سکتے ہیں، وہ خیانت کر سکتے ہیں، وہ ظلم کر سکتے ہیں، وہ دھوکا دے سکتے ہیں، وہ قول و قرار سے پھر سکتے ہیں، وہ چوری اور ڈاکہ زنی کر سکتے ہیں، وہ دنگا اور فساد کر سکتے ہیں، وہ بے غیرتی اور بے حیائی کے سارے کام

کر سکتے ہیں، اور ان سب ناپاکیوں میں ان کا اوسط کسی کافر قوم سے کم نہیں ہے۔ پھر ہماری معاشرت، ہمارا رہن سہن، ہمارے رسم و رواج اور ہماری تقریبات، ہمارے میلے اور عرس، ہمارے جلسے اور جلوس، غرض ہماری اجتماعی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس میں ہم اسلام کی کسی ڈھنگ بھی صحیح نمائندگی کرتے ہوں۔ یہ چیز گویا اس بات کی زندہ شہادت ہے کہ اسلام کے پیرو خود ہی اپنے لیے اسلام کے بجائے جاہلیت کو زیادہ قابلِ ترجیح سمجھتے ہیں۔ ہم مدرسے بناتے ہیں تو علم اور نظامِ تعلیم اور روحِ تعلیم سب کچھ کفار سے لیتے ہیں۔ ہم انجمنیں قائم کرتے ہیں تو مقصد، نظام اور طریقِ کار سب کچھ وہی رکھتے ہیں جو کفار کی کسی انجمن کا ہو سکتا ہے۔ ہماری پوری قوم بحیثیتِ مجموعی کوئی جدوجہد کرنے اٹھتی ہے تو اس کا مطالبہ، اس کی جدوجہد کا طریقہ، اس کی جمعیت کا دستور و نظام، اس کی تجویزیں، تقریریں اور بیانات، سب کچھ وہی ہوتا ہے جو کافر قوموں کی جدوجہد کا ہوتا ہے۔ حد یہ ہے کہ جہاں ہماری آزاد یا نیم آزاد حکومتیں موجود ہیں وہاں بھی ہم نے اساسِ حکومت، نظامِ حکومت، اور مجموعۂ قوانین کفار سے لیا ہے۔ اسلام کا قانون بعض حکومتوں میں صرف پرسنل لا کی حد تک رہ گیا ہے اور بعض نے اس کو بھی ترمیم کیے بغیر نہیں چھوڑا ہے۔ حال میں ایک انگریز مصنف (Laurence Browne) نے اپنی کتاب (The Prospects of Islam) میں طعنہ دیا ہے کہ ہم نے جب ہندوستان میں اسلام کے دیوانی اور فوجداری قوانین کو دقیانوسی اور ناقابلِ عمل سمجھ کر منسوخ کیا تھا اور مسلمانوں کے لیے صرف ان کے پرسنل لا کو رہنے دیا تھا تو مسلمانوں کو یہ سخت ناگوار ہوا تھا، کیونکہ اس طرح ان کی پوزیشن وہی ہو جاتی تھی جو کبھی اسلام کی حکومت میں ذمیوں کی تھی۔ لیکن اب صرف یہی نہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اسے پسند کر لیا ہے، بلکہ خود مسلمان حکومتوں نے بھی اس معاملہ میں ہماری تقلید کی ہے۔ ٹرکی اور البانیا نے تو اسے بھی دور کر کے قوانینِ نکاح و طلاق و وراثت تک میں بھی ہمارے معیارات کے مطابق "اصلاحات" کر دی ہیں، اور یہ بات کھل گئی ہے کہ مسلمانوں کا یہ تصور کہ قانون کا ماخذ ارادۂ الٰہی ہے ایک "مقدس افسانے" (Pious fiction) سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ — یہ ہے وہ عملی شہادت جو تمام دنیا کے مسلمان تقریباً متفق ہو کر اسلام کے خلاف دے رہے ہیں۔ ہم زبان سے خواہ کچھ کہیں مگر ہمارا اجتماعی عمل گواہی دے رہا ہے کہ اس دین کا کوئی طریقہ ہمیں پسند نہیں اور اس کے کسی قانون میں ہم اپنی فلاح و نجات نہیں پاتے۔

یہ کتمان حق اور یہ شہادت زور جس کا ارتکاب ہم کر رہے ہیں، اس کا انجام بھی ہمیں وہی دیکھنا پڑا ہے جو ایسے سخت جرم کے لیے قانون الٰہی میں مقرر ہے۔ جب کوئی قوم خدا کی نعمت کو ٹھکراتی ہے اور اپنے خالق سے غداری کرتی ہے تو خدا دنیا میں بھی اس کو عذاب دیتا ہے اور آخرت میں بھی۔ یہودیوں کے معاملہ میں خدا کی یہ سنت پوری ہو چکی ہے اور اب ہم مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہیں۔ خدا کو یہود سے کوئی ذاتی پرخاش نہ تھی کہ وہ صرف انہی کو اس جرم کی سزا دیتا، اور ہمارے ساتھ اس کی کوئی رشتہ داری نہیں کہ ہم اسی جرم کا ارتکاب کریں اور سزا سے بچ جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم حق کی شہادت دینے میں جتنی جتنی کوتاہی کرتے گئے ہیں اور باطل کی شہادت ادا کرنے میں ہمارا قدم جس رفتار سے آگے بڑھا ہے، ٹھیک اسی رفتار سے ہم گرتے چلے گئے ہیں۔ پچھلی ایک ہی صدی کے اندر مراکش سے لے کر شرق الہند تک ملک کے ملک ہمارے ہاتھ سے نکل گئے، مسلمان قومیں ایک ایک کر کے مغلوب اور محکوم ہوتی چلی گئیں، مسلمان کا نام فخر و عزت کا نام نہ رہا بلکہ ذلت و مسکنت اور پسماندگی کا نشان بن گیا، دنیا میں ہماری کوئی آبرو باقی نہ رہی، کہیں ہمارا قتل عام ہوا، کہیں ہم گھر سے بے گھر کیے گئے، کہیں ہم کو سوء العذاب کا مزا چکھایا گیا اور کہیں ہم کو چاکری اور خدمت گاری کے لیے زندہ رکھا گیا۔ جہاں مسلمانوں کی اپنی حکومتیں باقی رہ گئیں وہاں بھی انھوں نے شکستوں پر شکستیں کھائیں اور آج ان کا حال یہ ہے کہ بیرونی طاقتوں کے خوف سے لرز رہے ہیں، حالانکہ اگر وہ اسلام کی قولی و عملی شہادت دینے والے ہوتے تو کفر کے علمبردار ان کے خوف سے کانپ رہے ہوتے۔ دور کیوں جائیے، خود ہندوستان میں اپنی حالت دیکھ لیجیے۔ ادائے شہادت میں جو کوتاہی آپ نے کی بلکہ الٹی خلاف حق شہادت جو آپ اپنے قول و عمل سے دیتے رہے اسی کا تو یہ نتیجہ ہے کہ ملک کا ملک آپ کے ہاتھ سے نکل گیا، پہلے مرہٹوں اور سکھوں کے ہاتھوں آپ پامال ہوئے، پھر انگریز کی غلامی آپ کو نصیب ہوئی، اور اب پچھلی پامالیوں سے بڑھ کر پامالیاں آپ کے سامنے آ رہی ہیں۔ آج آپ کے سامنے سب سے بڑا سوال اکثریت و اقلیت کا ہے اور آپ اس اندیشے سے کانپ رہے ہیں کہ کہیں ہندو اکثریت آپ کو اپنا محکوم نہ بنا لے اور آپ وہ انجام نہ دیکھیں جو شودر قومیں دیکھ چکی ہیں۔ مگر خدا را مجھے بتائیے کہ آپ اسلام کے سچے

گواہ ہوتے تو یہاں کوئی اکثریت ایسی ہو سکتی تھی جس سے آپ کو کوئی خطرہ ہوتا؟ یا آج بھی اگر آپ قول اور عمل سے اسلام کی گواہی دینے والے بن جائیں تو کیا یہ اقلیت و اکثریت کا سوال چند سال کے اندر ہی ختم نہ ہو جائے؟ عرب میں ایک فی لاکھ کی اقلیت کو نہایت متعصب اور سخت ظالم اکثریت نے دنیا سے نیست و نابود کر دینے کی ٹھانی تھی، مگر اسلام کی سچی گواہی نے دس سال کے اندر اسی اقلیت کو سو فیصدی اکثریت میں تبدیل کر دیا۔ پھر جب یہ اسلام کے گواہ عرب سے باہر نکلے تو پچیس سال کے اندر ترکستان سے لے کر مراکش تک قومیں کی قومیں ان کی شہادت پر ایمان لاتی چلی گئیں اور جہاں سو فیصدی مجوسی، بت پرست اور عیسائی بستے تھے وہاں سو فیصدی مسلمان بسنے لگے۔ کوئی ہٹ دھرمی، کوئی قومی عصبیت اور کوئی مذہبی تنگ نظری اتنی سخت ثابت نہ ہوئی کہ حق کی زندہ اور سچی شہادت کے آگے قائم رہ سکتی۔ اب اگر آپ پامال ہو رہے ہیں اور اپنے آپ کو اس سے شدید تر پامالی کے خطرے میں مبتلا پاتے ہیں تو یہ کتمانِ حق اور شہادتِ زور کی سزا کے سوا اور کیا ہے۔

یہ تو اس جرم کی وہ سزا ہے جو آپ کو دنیا میں مل رہی ہے۔ آخرت میں اس سے سخت تر سزا کا اندیشہ ہے۔ جب تک آپ حق کے گواہ ہونے کی حیثیت سے اپنا فرض انجام نہیں دیتے اس وقت تک دنیا میں جو گمراہی بھی پھیلے گی، جو ظلم و فساد اور طغیان بھی برپا ہوگا، جو بداخلاقیاں اور بدکرداریاں بھی رواج پائیں گی ان کی ذمہ داری سے آپ بری نہیں ہو سکتے۔ آپ اگر ان برائیوں کے پیدا کرنے کے ذمہ دار نہیں ہیں تو ان کی پیدائش کے اسباب باقی رکھنے اور انھیں پھیلنے کی اجازت دینے کے ذمہ دار ضرور ہیں۔

(باقی)

جماعت اسلامی کا تیسرا اجتماع عام بمقام پٹنہ

بتاریخ ۱۱، ۱۲ اور ۱۳ جمادی الاول ۱۳۶۶ھ مطابق ۴، ۵، ۶ اپریل ۱۹۴۷ء

حسب اعلان سابق جماعت اسلامی کا تیسرا اجتماع عام مندرجہ عنوان تاریخوں میں پٹنہ صوبہ بہار میں منعقد

(۱) حلقہ مشرقی ہند (یعنی یوپی، بہار، اڑیسہ، بنگال اور آسام) کے تمام ارکان جماعت کے لیے شرکت لازم ہے الا یہ کہ کوئی عذر شرعی مانع ہو۔

بقیہ حلقوں سے قیم صاحبان، مقامی جماعتوں کے امراء اور جہاں کسی ایک مقام پر دس یا دس سے زائد ارکان موجود ہوں وہاں کے مقامی امیر کے علاوہ ہر دس ارکان میں سے ایک منتخب نمائندے کو شریک اجتماع ہونا چاہیے۔ دوسرے ارکان کے لیے حاضری ضروری نہیں ہے۔ ارکان کے سوا دوسرے حضرات کے لیے کوئی پابندی نہیں۔

(۲) جو لوگ اجتماع میں شرکت کا ارادہ رکھتے ہوں خواہ ہمدرد ہوں یا ارکان ان کو چاہیے کہ ۲۰ مارچ سنہ ۴۷ء تک سید محمد حسنین صاحب (دفتر جماعت اسلامی، سلطان گنج، مہندرو، پٹنہ) کو اپنے ارادے کی اطلاع کر دیں اور اگر کسی گروہ یا جماعت کی جانب سے اطلاع دے رہے ہوں تو ممبروں کی ٹھیک ٹھیک تعداد لکھیں جس میں بعد کو کسی قسم کا رد و بدل نہ ہو۔

(۳) خواتین بھی اس اجتماع میں شریک ہو سکتی ہیں اگرچہ ان کی شرکت لازم نہیں ہے۔ جو خواتین شریک ہونے کا ارادہ رکھتی ہوں ان کو بھی ہدایت مندرجہ بالا کے مطابق اپنے ارادے کی اطلاع دینی چاہیے۔

(۴) شرکائے اجتماع کو ۴ اپریل کی صبح تک بہرحال مقام اجتماع پر پہنچ جانا چاہیے تاکہ اجتماع کے پہلے اجلاس ہی میں وقت پر شریک ہو سکیں۔

(۵) ارکان مجلس شوریٰ ۳ اپریل کی شام تک پٹنہ پہنچ جائیں تاکہ اجتماع سے پہلے مشورہ شروع کیا جا سکے۔

(۶) راشن کی مشکلات کے پیش نظر تمام شرکائے اجتماع دو دو سیر آٹا یا چاول اور ایک پاؤ شکر ایام اجتماع کے لیے ساتھ لے کر آئیں۔ سب احباب کو حتی الامکان [illegible] چاہیے۔

(۷) اگرچہ اپریل کے شروع میں بہار میں گرمی شروع ہو جاتی ہے لیکن بستر میں کمبل یا توشک ضرور ساتھ لانا چاہیے۔

تنبیہ: تمام شرکائے اجتماع سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ دوران اجتماع میں ارکان جماعت کی طرح ضابطہ جماعت کے پابند رہیں گے اور اجتماع کے وقار، سنجیدگی اور اس کی دینی فضا کو ہر لحاظ سے قائم رکھنے میں پورا تعاون فرمائیں گے۔ سفر کے دوران میں بھی حتی الامکان اسلامی اخلاق کی پابندی اور اپنے مسلک کی صحیح نمائندگی کی کوشش کی جائے۔

خاکسار طفیل محمد قیم جماعت اسلامی، دار الاسلام، پٹھان کوٹ۔

زکوٰۃ

معاشیاتی نقطۂ نظر سے

(۲)

از جناب نعیم صدیقی صاحب

محتاج اور فقرزدہ ہندوستان سب سے پہلے تو معلوم ہونا چاہیے کہ ہندوستان میں وہ عنصر کتنا ہے جو ابتدائی ضروریات میں فوری امداد کا ہر آن مستحق رہتا ہے، اور ایسے لوگ کتنے ہیں جن سے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ دوسروں کی اعانت کے لیے اپنے اموال میں سے کچھ دے سکتے ہوں۔

یہ تو معلوم ہے کہ تازہ ترین مردم شماری کی رو سے ہندوستان کی آبادی تقریباً چالیس کروڑ ہے۔ اب مختلف اندازہ کرنے والوں نے اس آبادی کی معاشی حالت کے متعلق جو اندازے کیے ہیں، ان کا خلاصہ عرض کیا جاتا ہے:

ماہرین کا خیال ہے کہ اگر ہندوستان کی پوری دولت کو اس کی آبادی پر برابر برابر تقسیم کر دیا جائے تو بھی اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہ ہوگا کہ ملک کا ہر شخص فلاکت زدہ اور مصیبت زدہ رہے، بجائے یہ کہ کچھ لوگوں کے ہاں دولت کے انبار سمٹ جائیں، اور دوسروں کے حصہ میں وہ قلیل اور حقیر سی پونجی بھی نہ رہ جائے جو مساویانہ تقسیم سے متعین ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو:۔

فی کس آمدنی	سال اندازہ	فی کس آمدنی	سال اندازہ
۳۰ روپے (لارڈ کرزن)	سنہ ۱۹۰۰	۲۰ روپے (نوروجی)	سنہ ۱۸۷۰
۵۸ ″ (مسٹر شیراس)	سنہ ۳۳-۱۹۳۲	۱۱۴ ″ (مسٹر شیراس)	پہلی جنگ عظیم کے بعد

نوٹ (سنہ ۱۹۱۴ کے بعد آمدنی کا اضافہ ان بحرانی احوال کی وجہ سے ہے جو جنگ کے نتائج طور پر نمودار ہوئے تھے)۔

اس کے بعد تازہ ترین اندازہ جو جنگ عظیم ثانی کے بعد کیا گیا ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ ایک ہندوستانی کے حصہ میں مساویانہ تقسیم کی رو سے چونسٹھ روپے چھ آنے سے لے کر اٹھتر روپے سالانہ تک دولت آ سکتی ہے۔ ان دونوں رقموں کے بیچ میں سٹر کا ہندسہ لے لیجیے۔ یعنی:-

سالانہ: ۷۰ روپے۔ ماہانہ: ۵ روپے ۱۳ آنے ۴ پائی۔ یومیہ: ۳ آنے ۱/۲ ۱۰ پائی۔

اب ہمارا ہندوستانی اس ۳ آنے ۱/۲ ۱۰ پائی سے روٹی بھی کھائے گا، کپڑا بھی پہنے گا، مکان بھی بنائے گا، صحت کا رکھ رکھاؤ بھی کرے گا، حکومت کو فوج، پولیس، عدالت، تعلیم، وغیرہ مشترکہ کاموں کے لیے ٹیکس اور چندے بھی دے گا ——— اور وہ یہ سب کچھ اسی تین آنے سوا پائی میں کرتا ہے! ——— ایک دلچسپ معما ہے یا نہیں؟

ہاں، یہاں اس امر کا ذکر کر دینا بھی ضروری ہے کہ جنگ عظیم ثانی کی جو فضا اب تک معاشیاتی مسائل پر مسلط ہے، وہ ہمارے ہندوستانی کی آمدنی میں بہت بڑا اضافہ کر گئی ہے، مگر یہ محض نمائشی اضافہ ہے، کیونکہ یہ نتیجہ ہے "افراط زر" کا، یعنی مصنوعی زر کاغذی اتنا پھیلا دیا گیا ہے کہ اس کی قیمت گر گئی ہے اور اشیاء کی گرانی تا رمل سے کئی سو فیصدی تک بڑھ گئی ہے، اس وجہ سے آمدنی کی اس نمائشی ترقی کا تذکرہ غیر ضروری ہے، ورنہ اس سے غلط فہمی ہوگی۔ پیداواری اضافہ غالباً کل ۲۰ فیصد ہوا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے ہندوستانی صاحب کی یومیہ آمدنی تین آنے ساڑھے آٹھ پائی ہو گئی ہے سالانہ ۸۴ روپے۔ تو پھر کیا ہو؟

دولت کی اس کمی کا علاج تو اضافۂ پیداوار ہی سے ممکن ہے اور اس پہلو سے تدابیر کو سوچنا معاشیات کا ایک مادی میدان کار ہے۔ ہماری دلچسپی معاشیات کے اخلاقی پہلو سے ہے یعنی ہم توجہ اس پر دیتے ہیں کہ سوسائٹی کے افراد میں صلاحیتوں اور قوتوں کا جو اختلاف ہے وہ انفرادی آزادی کی فطری نعمت کو بحال رکھنے کی صورت میں تقسیم دولت میں جو ناہمواری پیدا کر دیتا ہے، اس کے ازالہ کی مختلف اصلاحی تدابیر میں سے ایک تدبیر "زکوٰۃ" کے عمل کا جائزہ لیں۔ جن لوگوں کو ہندوستان کی دولت میں سے زیادہ حصہ ملا ہے ان کے کندھوں پر ان لوگوں کی اعانت کی ذمہ داری کا بوجھ رکھیں جو بعض کمزوریوں کی وجہ سے اپنے اصل حصے سے بھی کم پا رہے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک ماہر کا اندازہ یہ ہے کہ ہندوستان کی ۹۰٪ آبادی مفلوک الحال ہے اور صرف ۱۰٪ بآرام زندگی بسر کر رہی ہے۔ ہماری رائے میں یہ اندازہ ایک حد تک صحیح ہے۔ مگر اس اندازہ میں مفلوک الحال سے مراد ایسی حالت ہے جس میں جملہ انسانی ضروریات یا ان کے کسی بھی حصہ کو پورا کرنے میں مشکلات حائل ہوں — اور وہ ضروریات یہ ہیں :-

۱- غذا؛

۲- لباس۔

۳- مکان۔

۴- صحت۔

۵- تعلیم۔

۶- آرام اور تفریح کے ناگزیر وسائل۔

آخری ضرورت کو اس فہرست سے آپ سردست حذف ہی سمجھیے اور تعلیم کو بھی ابھی درکنار رکھیے، بلکہ صحت کو بھی، — حتیٰ کہ مکان اور لباس کا مسئلہ بھی ابھی نظر انداز کر کے صرف "غذا" کے سوال کو لے لیجیے؛ کیونکہ یہ ایسی ضرورت ہے جس کے بغیر روح اور جسم کا رشتہ برقرار ہی نہیں رکھا جا سکتا — اولین اور اہم ترین ضرورت!

اس معاملہ میں ہندوستان کا حال ذرا یہ ہے کہ

ا- ۳۹٪ باشندوں کی غذا متوازن اور معیاری ہے!

ب- ۴۱٪ باشندوں کی غذا غیر متوازن اور غیر معیاری ہے!

ج- ۲۰٪ باشندوں کی غذا بہت ہی ناکافی اور ردی ہے!

نوٹ:- اس آخری طبقہ کے ۸ کروڑ افراد میں بالکل فاقہ مست اور گداگر وغیرہ سبھی کو شامل سمجھیے!

گویا اگر صرف غذا ہی کے اولین مسئلے پر توجہ دی جائے تو ہمارے پاس ۸ کروڑ باشندے یا (۵ افراد فی کنبہ کے اوسط سے) ایک کروڑ ۶۰ لاکھ کنبے دوسروں کی مدد کے محتاج ہیں۔ نیز یہ کہ اگر "زکوٰۃ کا امدادی فنڈ"

ان لوگوں کی اولین ضرورت پوری کرکے بچ رہے تو "ناقص غذا" پر بسر کرنے والی ۴۱ فی صد آبادی یا ۱۶۴۰۰۰۰۰ باشندوں یا ۳۲۸۰۰۰۰۰ کنبوں کو ضروری مالی امداد درکار ہے! ہاں اگر طبقہ "ج" کی ضرورت سے کچھ نہ بچے تو ان لوگوں کو ان کے حال پر چھوڑا بھی جا سکتا ہے۔

دوسرے یہ بات بھی واضح ہے کہ بقیہ ۳۹ فیصدی آبادی ہی میں وہ لوگ پائے جا سکتے ہیں جن سے زکوٰۃ کا امدادی فنڈ "جمع ہونا ہے — اس امر کا امکان ضرور ہے کہ طبقہ "ا" میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہو جو مناسب غذا کھا پی کر کچھ بچا نہ سکتے ہوں کہ ان پر زکوٰۃ عائد ہو سکے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ذہن نشین رہے کہ طبقہ "ب" میں ایسی نرالی مخلوق پائی جا سکتی ہے جو غذا کے معاملہ میں دانستہ کنجوسی اور بنیا پن کر کر کے کچھ نہ کچھ پس انداز کر رہی ہو — یہ نرالی مخلوق کم ضرور ہو گی!

خیر ایک سرسری حساب سے یوں سمجھیے کہ کل آبادی کا ۱۴ فیصدی حصہ ایسا ہے جس سے ہم کچھ نہ کچھ چندہ زکوٰۃ فنڈ کے لیے وصول کر سکتے ہیں — اور تقریباً ۳۰ فیصد پر خرچ کر سکتے ہیں!

اب لیجیے دوسرا مسئلہ لباس کا — تاکہ اگر غذا کے مسئلے کو حل کرنے سے فنڈ بچ نکلے تو اسی دوسری شدید ضرورت پر صرف کیا جا سکے۔

اندازہ کیا گیا ہے کہ ہندوستان میں کپڑے کا کل صرف ½ ۱۰ ارب گز ہے — اگر یہ مقدار برابر تقسیم ہو تو ہر ہندوستانی کو ½ ۲۰ گز کپڑا سالانہ ملتا ہے، مگر تقسیم یوں تو ہوتی نہیں۔ بلکہ بعض کو زیادہ حصہ ملتا ہے، بعض کو کم۔ تخمیناً ہر دس ہندوستانیوں میں سے ایک کا لباس بہت ہی اچھے معیار کا ہوتا ہے، دوسرے کا بھی مناسب اور تن پوش! تیسرے کا اگرچہ کافی نہیں ہوتا، مگر ناکافی بھی اسے نہ سمجھنا چاہیے گذر کے لیے مناسب ہے! یہ تو ۱۲ کروڑ افراد کا حساب ہوا۔ اب رہے ۲۸ کروڑ تو یہ بہت ہی کم حصہ پاتے ہیں۔ یعنی ان میں سے مرد تو ایک لنگوٹ اور ایک پگڑی پر گذر کرتے ہیں اور اپنی عورتوں کو ایک ساڑی یا زیادہ سے زیادہ اس کے ساتھ ایک پوری انگیا فراہم کر دیتے ہیں اور بس۔ ان میں سے ۸ کروڑ کی حالت اگر مصلحتہً قابلِ برداشت قرار دے بھی دی جائے تو بقیہ ۲۰ کروڑ تو خود عریاں رہ کر ملک کے نظامِ معاشی کو اور اس کی اخلاقی ابتری کو ننگا کر رہے ہیں۔ یوں سمجھیے کہ ان بے چاروں میں سے کسی کو

اگر سالانہ سے زائد کپڑا مل ہی نہیں سکتا۔ آگے چل کر ہم غور کریں گے کہ زکوٰۃ فنڈ اس عریانی کا کیا علاج کرسکتا ہے جس کا نہ الٹا ہے نہ سیدھا!

اس کے بعد مکانوں کا مسئلہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ اگر غذا اور لباس کے مسئلے سے ہم نمٹ لیں تو پھر اس پر فوری توجہ ناگزیر ہوگی۔ گذشتہ مردم شماری بتاتی ہے کہ مکانوں کی کل تعداد ہندوستان میں:-

ا- دیہی = ۶۶۴۳۶۰۹۴

ب- قصباتی = ۹۵۹۹۲۵۱

مجموعی = ۷۶۰۳۵۳۴۵

ہے۔ اب حساب یوں بنے گا کہ ہر ہزار گھر میں ۵۱۱۶ افراد یا ایک گھر میں ۵ سے زیادہ افراد رہتے ہیں۔ اس حساب میں یہ بات ملحوظ رہے کہ ملک میں بہت بڑی تعداد مجردین اور بیوہ عورتوں کی بھی ہے اور ۵ افراد سے کم کے کنبے ۵ افراد سے زیادہ کے کنبوں سے زیادہ ہیں۔ اس لحاظ سے مکانوں کی اس تعداد کو کم از کم دوگنا ہونا چاہیے، ورنہ بہت سے افراد کھیتوں میں، بازاروں اور گلیوں میں اور دکانوں کے چبوتروں پر گرمی ہو کہ سردی، آسمان کی کھلی چھت کے نیچے سونے پر مجبور ہیں۔ اب اگر ہمارے پاس کافی فنڈ ہوں تو ہمیں چاہیے کہ موجودہ مکانات کی تعداد ڈیڑھ گنی کردیں۔

اس کے بعد صحت پر توجہ کی جانی چاہیے۔ یہ مسئلہ بہت ہی وسعتِ بحث کا طلبگار ہے اور اس کے ساتھ سیکڑوں امور کا قریبی تعلق ہے، مگر ہم اپنے موضوع کی رعایت سے چند اہم پہلوؤں پر غور کرنا کافی سمجھتے ہیں۔

یہ معلوم کرکے آپ کو حیرت ہوگی کہ کل آبادی میں سے دس لاکھ افراد سالانہ ملیریا کا شکار ہوتے ہیں اور بہت بڑی تعداد اس میں مبتلا ہونے کی وجہ سے کام سے الگ ہوجاتی ہے اور بسترِ مرض سے اٹھ کر بھی ایک عرصہ تک کام کے قابل نہیں ہوتی۔ ۸۰ لاکھ افراد دق اور سل اور ٹائیفائڈ اور دوسرے بخاروں کا لقمہ ہوجاتے ہیں۔ ہیضے کے حملوں کی وجہ سے سنہ ۳۰ء اور سنہ ۴۰ء کے درمیان اوسطاً ۱۰ لاکھ اموات سالانہ واقع ہوئیں۔ طاعون اور جذام اور دوسری بیماریوں کے اعداد و شمار ہمارے سامنے نہیں ہیں۔ آنکھیں ضائع ہونے کی وجہ سے جو لوگ بے کار ہوجاتے ہیں ان کا بھی حساب عرض نہیں کیا جاسکتا۔

اس سے صحت کی حقیقت کا اندازہ لگائیے کہ ہندوستانیوں کی عمر کا اوسط ۲۶٫۹۱ سال ہے اور عورتوں میں ۲۶٫۵۶ سال۔

خصوصیت سے بچوں کی شرح اموات بہت ہی دردناک حد تک زائد ہے۔ مثلاً ۱۹۴۳ء میں جہاں بچوں کا اضافہ ۳۳ فی ہزار کے حساب سے ہوا وہاں ان میں سے ۲۲ کم عمری ہی میں موت کا شکار ہوئے۔ زچاؤں کی شرح اموات تخمیناً ۲۰ فی ہزار ہے! ——— جبکہ انگلستان میں ۲٫۹ فی ہزار شمار کی گئی ہے!

اب آپ سوچ سکتے ہیں کہ یہاں خاص صحت کے نقطۂ نظر سے غذا، لباس اور مکان کے مسئلہ کا صحیح حل بھی کتنا ضروری ہے اور پھر لوگوں کو توہمات سے نکالنے اور انھیں صفائی ستھرائی اور حفظ صحت کے ڈھنگ سکھانے کے لیے تعلیم کا انتظام ناگزیر ہے۔ اور مزید یہاں یہ کہ شفاخانوں کا اور ڈاکٹروں، دائیوں اور نرسوں کا اور تفریح گاہوں کا وسیع سلسلہ پھیلانا ہماری کتنی بڑی ضرورت ہے! ——— خیر اگر ہمارے زکوٰۃ فنڈ کو توفیق ہو تو وہ اس خدمت میں حصہ لے سکتا ہے!

آخر میں تعلیم کو لیجیے۔ یہ اگرچہ بظاہر ثانوی سی ضرورت معلوم ہوتی ہے، مگر پڑھے لکھے لوگ جانتے ہیں کہ اس کی مدد کے بغیر ہماری اولین ضرورتیں بھی پوری نہیں ہو سکتیں۔ حال یہ ہے کہ تازہ مردم شماری کی رو سے صرف ۱۲۰ اشخاص فی ہزار خواندہ ہیں ——— اور ان میں سے بہت سے لوگ برائے نام خواندہ طبقہ میں بطور "حسن ظن" شمار کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ ہمیں نوشت و خواند، حساب کتاب، دنیا کی معمولی سی واقفیت، صحت و صفائی کے اصولوں، اور پیشہ ورانہ فنی معلومات کے علاوہ دینی اور اخلاقی تعلیم کم از کم ناگزیر حد تک کسی شخص کو بہم پہنچا دینے کے بعد اسے "خواندہ" شمار کرنا چاہیے۔ مگر خیر ابھی تک ۱۲۰ فی ہزار، یا کل آبادی میں سے ۴ کروڑ ۸۰ لاکھ افراد خواندہ ہیں، اور بقیہ ۳۵ کروڑ ۲۰ لاکھ جانوروں کی طرح محنت مزدوری کرتے، کچھ کھاتے پیتے چار دن جی کر عدم آباد کو رخصت ہو جاتے ہیں۔

آخر میں ہم نے آرام اور تفریح کی جو دفعہ ضروریات کی فہرست میں رکھی تھی، وہ اگرچہ بجائے خود بہت اہم ہے، مگر آپ جانتے ہیں کہ "یہ ہندوستان ہے" ——— اس لیے اسے فہرست سے بالکل خارج کر دیجیے۔ ابتدائی مسائل کے حل ہونے کے بعد آئندہ کوئی نسل اسے حل کرتی رہے گی۔ اس وقت تو شدید ترین

امور پر غور کرنا کافی ہو کیونکہ آپ حالات کا سروے کرنے اٹھیں تو لوگوں کی بعض ضروریات چاروں طرف سے جھپٹ کے آجاتی ہیں، بھوک، برہنگی، جہالت، بیماری، ——— غریب' بے آرامی" کو یہاں کیا اہمیت دی جاسکتی ہے!

(۱) ۴۰ کروڑ باشندوں کے لیے مناسب مقدار میں روٹی فراہم کرنا۔

(۲) ۱۶ کروڑ ۴۰ لاکھ باشندوں کی غذا کو بہتر بنانا۔

(۳) ۴۰ کروڑ افراد کے لیے ۔اگز فی فرد کے حساب سے کپڑے کے حصے میں اضافہ کرنا۔

(۴) ۳۰۰۱۶۷۶۳ مکانات کی تعمیر۔

(۵) ڈاکٹروں اور دایاؤں کی ایک کثیر تعداد ——— طبی تحقیقات کے ادارے ——— شفا خانے ——— سینی ٹوریم ——— اور دواؤں کے بڑے بڑے اسٹاک!

(۶) نئے اسکولوں اور تعلیم بالغان کے مراکز کا اجراء۔

ان اہم ضروریات سے فاضل اگر کچھ رقوم رہیں تو عوام کی امداد کے اور بہت سے شعبے ہو سکتے ہیں۔

ہندوستان میں زرعی زکوٰۃ کا اندازہ | ہندوستان ایک زرعی ملک ہے اور یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہاں کی ارضی پیداوار سے حکومت باطل کو جو مالیہ حاصل ہوتا ہے؛ نظام اسلامی کے تحت جو عشر حاصل ہو سکتا ہے اس کی مقدار بہت ہی کثیر بنتی ہے۔

پیشتر اس کے کہ ہم ایک سرسری اندازہ (Rough estimate) عشر کا قائم کریں، لازم ہے کہ عشر کے متعلق چند آئینی تفصیلات کو بیان کر دیں۔

(۱) حکم نص یہ ہے کہ جو زمینی پیداوار حاصل کرتے ہو اس پر زکوٰۃ دو۔ اس سے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مالک زمین کی طرح کاشتکار پر بھی زکوٰۃ (عشر) واجب الادا ہے؛ اس معاملہ میں دو رائیں ممکن ہیں:

ا۔ زمیندار اور کاشتکار دونوں زمین سے پیداوار اٹھاتے ہیں، اول الذکر ملکیت زمین اور بعض مصارف کے حق کی بنا پر اور ثانی الذکر محنت کے حق کی بنا پر ——— ان دونوں کو اپنے اپنے حصہ سے عشر دینا چاہیے۔

ب۔ کاشتکار تو محض مزدور ہے، جو اپنا معاوضہ کار جنس اور نقد دونوں شکلوں میں لے سکتا تھا

اور تنخواہ کا اصول ہو یا حصہ داری حاصل کا، بات ایک ہی ہے۔ اس وجہ سے اس پر عشر واجب نہیں!

مگر ان دونوں رایوں کا جوہر اگر جمع کر لیا جائے تو ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ زمیندار کو بھی اور کاشتکار کو بھی اس امر کی گنجائش ہونی چاہیئے کہ وہ اپنے مصارف اور معاش کو الگ کرنے کے بعد عشر نکال دیں۔ یا اگر زمیندار ہی عشر نکالے تو کل پیداوار سے نکالے اور پھر بقیہ دونوں میں تقسیم ہو۔ اسی وجہ سے شرع نے عشر کے لیے نصاب مقرر کیا ہے کہ مصارف کاشت و معاش بر آمد ہو جائیں۔

(۲) نصاب کیا ہے؟ ـــ بعض ائمہ کسی نصاب کے سرے سے قائل نہیں ہیں، بلکہ ہر مقدار پیداوار پر عشر کا عائد ہونا واجب مانتے ہیں، اور بعض کے نزدیک نصاب ہے۔ ہم بھی اسی رائے سے اتفاق رکھتے ہیں۔ اس نصاب کی مقدار میں بھی اختلاف رائے ہوا ہے، مگر سہولت کے لیے ہم اس رائے کو اختیار کرتے ہیں، جو فرمودۂ نبوی "لیس فی حب ولا تمر صدقة حتی تبلغ خمسة اوسق" سے ماخوذ ہے اور خمسة اوسق کو اندازاً ۱۰ من انگریزی کے برابر قرار دیتے ہیں۔

(۳) کس فصل کو استثنیٰ ہے؟ ـــ فرمودۂ نبوی ہے کہ لیس فی الخضراوات صدقة ولا فی العرایا صدقة۔ یعنی سبزیوں اور چارہ کی فصلوں اور وقتی (جن کا ذخیرہ نہ ہو سکے) پھلوں میں زکوٰۃ نہیں۔

(۴) بارانی زمین کی پیداوار میں زکوٰۃ کی شرح ۱/۱۰ ہے اور مصنوعی آبپاشی کی جائے تو (اس کے صرفہ و محنت کا لحاظ کرتے ہوئے) شرح زکوٰۃ ۱/۲۰۔ (عن عبد اللہ بن عمر عن النبی صلعم فیما سقت السماء والعیون او کان عثریا العشر وما سقی بالنضح نصف العشر۔)

ان ضروری اشارات کے بعد ہندوستان کی زرعی حالت کے متعلق یہ واضح رہے کہ ۱۹۳۴-۳۵ء[1] میں کل رقبۂ زیر کاشت .... ۲۹۵ ایکڑ تھا۔ اس میں سے مصنوعی طور پر آبپاش رقبہ .... ۵۲ کروڑ ایکڑ تھا اور بقیہ بارانی .... ۲۴۳ کروڑ ایکڑ تھا۔ یعنی اول الذکر کی پیداوار میں عشر کی شرح ۱/۲۰ ہو گی اور ثانی الذکر پیداوار میں ۱/۱۰۔

اس سارے رقبہ میں ۲/۴ کا رقبہ ایسا تھا جس میں چارہ کی فصلیں کاشت کی گئی تھیں اور تقریباً

[1] دوران جنگ میں چونکہ افراط زر کی کیفیت مصنوعی طور پر پیدا کی گئی ہے اور اس سے صحیح اندازہ میں خلل واقع ہوتا ہے اس وجہ سے قبل جنگ اعداد و شمار سے نتائج کا اندازہ کرنا زیادہ مناسب ہے۔

رقبہ سبزیوں کے لیے اندازاً ہمیں الگ کر دینا چاہیے یعنی کل ۲۰،۴ فیصد۔ رقبہ عشر سے مستثنیٰ رہے گا۔ یہ مقدار بنے گی دکروڑ سینتالیس لاکھ اسی ہزار ایکڑ۔ علاوہ بریں اندازاً زمین سے پیداوار حاصل کرنے والے زمینداروں کاشتکاروں میں سے وہ بڑی تعداد جو نصاب سے کم پیداوار دینے والا رقبہ رکھتی ہے۔ اس کی اراضی کو عشر سے مستثنیٰ کرنے کے لیے نصف رقبہ ہمیں الگ کر دینا چاہیے۔ یوں تو زراعت پر گذران کرنے والوں میں اکثر نصاب سے کم فصل دینے والا رقبہ رکھتے ہوں گے، لیکن چونکہ ان کے قبضہ میں اوسطاً فی کس رقبہ کم ہی آتا ہے، اس لیے لازماً نصاب سے زائد پیداوار حاصل کرنے والوں کی تعداد اگرچہ کم ہو مگر رقبہ زمین بحیثیت مجموعی ان کی طرف زیادہ جاتا ہے۔ اس وجہ سے نصف رقبہ کو عشر ادا کرنے والا رقبہ ماننا کچھ غلط اندازہ نہیں ہوگا۔

مگر محض رقبہ سے تو عشر کا اندازہ ہونے سے رہا، یہ تو متعین طور پر معلوم ہونا چاہیے کہ پیداوار کتنی ہوتی ہے کیونکہ عشر پیداوار پر محسوب ہوتا ہے۔

پیداواروں کے متعلق اگرچہ مفصل سال وار اعداد و شمار موجود ہیں مگر ان کی قیمت لگا کر اندازہ قائم کرنے سے بہتر یہ ہے کہ ماہرین کا لگایا ہوا اندازہ پیش نظر رکھا جائے۔ مثلاً

منو مسانی نے مختلف خوردنی و صنعتی اجناس کی پیداواروں کو پیش نظر رکھ کے قبل جنگ کے نرخوں کی روشنی میں یہ رائے دی ہے کہ ہندوستان میں فی ایکڑ اوسط زرعی پیداوار کی آمدنی ۵۰ روپے ہے۔ اب کل مزروعہ رقبہ انتیس کروڑ پچاس لاکھ ایکڑ میں سے نصف کو مستثنیٰ کر دیجیے جس کے مالکوں یا مزارعوں کو اتنا عشر سے کم پیداوار ملتی ہے۔

اب رہا زائد از نصاب پیداوار دینے والا رقبہ:	۱۴۷۵۰۰۰۰۰	ایکڑ
اس میں سے مصنوعی آبپاشی	۲۶۰۰۰۰۰۰	ایکڑ
بارانی =	۱۲۱۵۰۰۰۰۰	ایکڑ

مصنوعی آبپاشی رقبہ میں سے چارہ اور سبزی اگانے والے ۲۰،۴ پر رقبہ کی منہائی ۲۶۰۰۰۰۰۰ / ۳۰۷۴۰۰۰ / ۲۳۹۲۶۰۰۰

پیداوار بحساب ۵۰ روپیہ فی ایکڑ =	۱۱۹۸۸۰۰۰۰۰	روپیہ
زکوٰۃ بحساب ۱/۲۰ =	۵۹۹۴۰۰۰۰	روپیہ
بارانی رقبہ میں سے چارہ اور سبزی اگانے والے ۲۰۶۰ بنجر رقبہ کی منہائی	۱۲۱۵۰۰۰۰۰ ۱۰۲۰۶۰۰۰ ۱۱۱۲۹۴۰۰۰	
پیداوار بحساب ۵۰ روپیہ فی ایکڑ =	۵۵۶۴۷۰۰۰۰۰	روپیہ
زکوٰۃ بحساب ۱/۱۰ =	۵۵۶۴۷۰۰۰۰	"
دونوں رقبوں کی زکوٰۃ کا مجموعہ ـــــ =		
بارانی =	۵۵۶۴۷۰۰۰۰	روپیہ
مصنوعی آبپاشی =	۵۹۹۴۰۰۰۰	روپیہ
میزان	۶۱۶۴۱۰۰۰۰	"

یہ رقم اکسٹھ کروڑ چونسٹھ لاکھ دس ہزار روپے سالانہ حاصل ہوگی۔

اور اگر بقیہ نصف رقبہ پر بھی اس نظریہ کے تحت زکوٰۃ لی جائے جس میں زرعی زکوٰۃ کے لیے کوئی نصاب تسلیم نہیں کیا گیا تو یہ رقم دگنی ہو جائے گی یعنی ۱۲۳۲۸۲۰۰۰۰ روپیہ سالانہ۔

اب اگر اتنی رقم ہر سال غربا کی امداد کے لیے نکالی جائے تو خیال کیجیے کہ "سرمایہ داری" کس طرح گھل گھل کے ختم ہو جائے گی اور مفلسی رفتہ رفتہ کیسی تونمند ہو کے رہے گی۔ روپے اور دولت کے سمندر میں سے اتنی بڑی نہر نکال کر پہلے کھیتوں تک لے جائی جائے تو کتنا بڑا انقلاب واقع ہو سکتا ہے۔

یہ ضرور ہے کہ زکوٰۃ لینے کے بعد آپ مروجہ مالیہ وصول کرنے کے حقدار نہ ہوں گے، اور جو مصارف آج مالیہ سے پورے ہوتے ہیں ان کے لیے یقیناً دوسرے ذرائع نکالنے پڑیں گے ـــــ یعنی امرا پر فرایہ، ٹیکس وغیرہ کا دائرہ وسیع کرنا ہوگا ـــــ مگر آپ غربا کا یہ حق مار کر اور اس کی جگہ مالیہ وصول کرکے اپنے مصارف ریاست کو پورا کرنے ہی کی وجہ سے تو سرمایہ داری کو پھلنے پھولنے کا موقع دے رہے تھے۔ اب اگر اس بلا کو روکنا ہے تو غربا کا حق غربا کے لیے چھوڑ دیجیے اور امرا سے اپنے مصارف دوسرے ذرائع سے پورے کیجیے۔

(باقی)

رسائل ومسائل

بہار کا خونین حادثہ اور مسلمان

سوال:۔ ایک طرف تو میرا ہر روز خیال یہ ہے کہ جو کچھ ہنگامے اور خانہ جنگیاں اس وقت ملک میں برپا ہیں اور آئندہ کے لیے جن کے بہت سے امکانات ابھر آئے ہیں وہ تمام تر مسلمانوں کی غیر اسلامی کوششوں اور غیر مسلموں کے قومی تعصب کا نتیجہ ہیں۔ اور ہم چونکہ تمام بنی نوع انسان کی اصلاح چاہتے ہیں، ہر ایک کو فلاح کی دعوت دینے والے ہیں اور ہر گروہ اور قوم کے یکساں خیرخواہ ہیں، اس لیے ہمیں بلاتخصیص ہر مظلوم و بیکس اور گرفتار بلا کی اعانت کرنی چاہیے اور اس میں کسی قسم کے قومی تعصب کو اثر انداز نہ رہنے دینا چاہیے۔ دوسری جانب آج تین چار دن سے مجھے اس خیال نے بیتاب کر رکھا ہے کہ وہ مظلومین جو ہر اس ظالمانہ طریق سے ستائے گئے ہیں جو انسانی ذہن میں آسکتا ہے، اور جن کی جانیں ہی نہیں، بلکہ عصمتیں اور آبروئیں، اور یہی نہیں بلکہ دین اور ایمان بھی سیلاب جفا کا لقمہ ہو رہے ہیں ۔۔۔ صرف اس لیے کہ وہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، اور اس کے رسول کے پیرو اور مسلمان کہلاتے ہیں اور وہ اسی پر قائم رہنا چاہتے ہیں، بجز اس کے جن کا کوئی جرم ثابت نہیں ہے۔ کیا ان مظلومین کے بارے میں ہم لوگ اس وقت مالکم لا تقاتلون فی سبیل اللہ والمستضعفین من الرجال والنساء والولدان الذین یقولون ربنا اخرجنا من ھذہ القریۃ الظالم اھلھا، الخ کے اولین مخاطب نہیں ہیں؟ میرے دل میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ ہیں اور ضرور ہیں! اس کی وجہ یہ کہ ہماری ہی جماعت عین اسلامی طریق پر ایک امیر کی قیادت میں فی سبیل اللہ جد و جہد کر رہی ہے۔ پھر ان مظلومین کی جماعت میں ہم صرف نرم قدم اٹھانے کا فیصلہ کیوں کر رہے ہیں؟

میرے نزدیک یہ ثابت نہیں ہے کہ کسی سخت اقدام کے لیے مادی ساز و سامان کی کوئی خاص مقدار ضرور فراہم ہونی چاہیے اور اگر اس کی کوئی حد مقرر کی بھی جائے تو وہ پہلے اسلامی غزوات کی حد ہو سکتی ہے۔ اس خیال سے بھی میری تشفی نہیں ہوتی کہ ہماری اخلاقی قوت و تربیت اس لائق نہیں ہے کہ ہم مقابلے کے لیے اٹھ کھڑے ہوں، کیونکہ یہ ممکن ہے کہ ایسے کسی معیار پر ہم صدیوں میں بھی نہ پہنچ سکیں اور یوں بھی صحابہ کے درجہ کو پہنچنا تو موجودہ دور میں محال ہے، کیونکہ وہ براہ راست رسول صلعم کی سیرت سے فیضیاب تھے، خود ان صحابہ میں سے جو لوگ سابقون الاولون میں سے تھے ان کے درجہ کو دوسرے حضرات ایمان و عمل کے اعلیٰ درجے طے کرنے کے باوجود نہ پہنچ سکے! پھر یہ نظریہ بھی مجھے مطمئن نہیں کرتا کہ یہ مظلومین اسلام کے سچے فرماں بردار نہیں ہیں اور ایمان کے جملہ مقتضیات پورے نہیں کر رہے ہیں۔ اگر ان کو ایمان عزیز نہ ہوتا تو آخر یہ اپنی جانیں کیوں دیتے؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم کب تک مکی زندگی کے تصور میں یونہی بیٹھے رہیں گے اور یہ دور کہاں تک طویل ہوگا۔

براہ کرم میری ان ذہنی الجھنوں کو صاف فرما دیجیے۔

جواب:- ہر دردناک حادثہ کی یہ فطرت ہے کہ وہ انسانی جذبات کو متلاطم کر دیتا ہے، بالخصوص جبکہ اس کی لپیٹ میں کوئی ایسا گروہ آ رہا ہو جس سے کسی طرح کے روابط موجود ہوں۔ آپ کے خط سے بھی یہی چیز ظاہر ہوتی ہے، حالانکہ مومن کی اولین خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ غم اور خوشی دونوں کے طوفانوں کے درمیان اپنے ذہنی جہاز کو متوازن رکھتا ہے اور اسے بے لنگر کا جہاز نہیں بننے دیتا۔ دوسری طرف یہ بات بھی ملحوظ رہنی چاہیے کہ کسی جماعت کے پاس جب قوت کی کچھ بھی پونجی جمع ہو جاتی ہے تو پھر ہر حادثہ اس کو یہی دعوت دیتا ہے کہ ساری قوت کو یہاں صرف ہو جانا چاہیے، بالکل اسی طرح جیسے کسی کی جیب میں چار پیسے ہوں تو بازار میں رکھی ہوئی ہر چیز اچھل اچھل کے یہ کہتی ہے کہ ان پیسوں کو تو مجھی پر صرف ہونا چاہیے اور پھر کچے مزاج کا آدمی ہوگا تو وہ اول قدم پر ہی جیب خالی کر دے گا اور بعد میں محسوس کرے گا کہ میں نے اصل ضرورت کی چیز تو پیچھے چھوڑ دی۔ جماعتیں بھی اگر جذبات کے تحت سطحی سوچ سے کام لیں تو پہلے قدم پر ہی ساری قوت صرف کر کے اپنے اصل نصب العین کے لیے کچھ پونجی باقی نہیں چھوڑتی ہیں، لیکن اگر وہ اپنے فکری توازن

کو برقرار رکھتی ہیں تو اخلاق کی چھوٹی چھوٹی کمزوریوں کو نظرانداز کرتی ہوئی قوت کے سارے تیر اصل نصب العین کے ہدف پر جا لگتی ہیں اور کامیاب رہتی ہیں اور جب تک یہ آخری موقع نہیں آتا عمومی مواقع سے قوت کا خزانہ بچاتی ہوئی گذر جاتی ہیں۔ مثلاً اس بیماری کے خونیں مادہ کو دیکھیے تو یہ جانا ہوگا یا یہ جانتا ہے کہ ہم اپنی ساری اجتماعی قوت اسی میں جھونک دیں، مگر نگاہیں اگر ٹھیک نصب العین پر جمی رہیں تو ہم قوم پرستانہ منازعات کے گرداب سے جماعت کا سفینہ بخیر و خوبی نکال کر لے جا سکتے ہیں اور ایک حد تک مخالفین کی اس سے بہتر مدافعت کر سکتے ہیں جو دوسری جماعتیں کر پا رہی ہیں یا کر رہی ہیں۔

یہ بات آپ نے صحیح نہیں لکھی کہ مسلمان قوم نے کوئی جرم نہیں کیا، لیکن بیماریں اس پر خواہ مخواہ قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ اس دعوے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کی دنیا میں یا تو کوئی قانون سرے سے رائج ہی نہیں ہوا ہے تو وہ قانون عدل نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قوموں اور جماعتوں کو تاریخ میں جو بھی حالات پیش آتے ہیں وہ خود ان کی کارگزاریوں کے فطری نتائج ہوتے ہیں اور بالکل اللہ تعالیٰ کے حکیمانہ اور عادلانہ قوانین کے تحت رونما ہوتے ہیں۔ ہر قوم خزانہ رب سے وہی کچھ پاتی ہے جو کچھ وہ جمع کراتی رہتی ہے۔ جس نے حسن عمل کی دولت جمع کرائی اس نے فلاح پائی اور جس نے غلط کاریوں کا خزانہ بھرا اس نے عذاب کا مزا چکھا۔ وما ظلمهم ولکن کانوا انفسهم یظلمون۔

مسلمانوں نے ہندوستان میں جو غلطیاں کی ہیں ان کی لمبی داستانوں سے قطع نظر کر کے اگر دورِ حاضر کی ایک ہی غلطی کو آپ پیش نظر رکھیں تو آپ کی موجودہ رائے کی کوئی بنیاد باقی نہیں رہتی۔ کیا یہ کوئی معمولی درجہ کی غلطی ہے کہ ہم نے اسلامی اصولوں اور اسلامی سیرت کی صحیح نمائندگی کرنے کے بجائے اپنے آپ کو غیر اسلامی فکر و عمل سے آلودہ کیا، اور نفس و شر کے خلاف جنگ آزما ہونے کے بجائے قومی اور گروہی بنیادوں سے دنیا پرستی کی لڑائی شروع کر دی اور اس کے ساتھ اسلام کا نام لینے اور اسلام کی نمائندگی کرنے کی جھوٹی شان اور ہیبت بھی چلی آ رہی تھی اس کا مظاہرہ بھی ہوتا رہا۔ یہ جرم اتنا بڑا جرم ہے کہ اس کے مقابلہ میں اب تک جو کچھ ہمیں پیش آیا ہے وہ بہت ہی کم ہے اور آئندہ جو کچھ پیش آ سکتا ہے اس کے تصور سے خدا کے قوانین مکافات عمل کی کچھ بھی سمجھ رکھنے والے خیر خواہان مسلمین کے دل کانپ اٹھتے ہیں۔

مگر مشیتِ الٰہی کے دھکے کھا کر بھی اس قوم کی آنکھیں نہیں کھل رہی ہیں۔

آپ نے یہ غلط ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں کا کوئی جرم اس کے سوا نہیں کہ وہ اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان رکھتے ہیں۔ بخلاف اس کے حقیقت یہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول پر اس طرح کا ایمان نہیں رکھتے جس طرح کے ایمان کا مطالبہ قرآن نے کیا ہے۔ اگر یہ شے فی الواقع ان میں ہوتی تو ہندو قوم کے کچھ ادنیٰ لوگ جہاں ان پر ظلم ڈھانے والے ہوتے وہاں اس کا صالح عنصر پورے کا پورا زبان سے اگر نہیں، تو کم از کم دل سے ضرور ان کے ساتھ ہوتا۔ پاکیزہ اصولوں اور اعلیٰ اخلاق کے اسلحہ کے ساتھ اگر کوئی گروہ کام کرنے اٹھے اور کسی مادی غرض کے بجائے محض اخلاقی مقاصد اس کے سامنے ہوں تو اس کا مقابلہ کوئی قوت جم کر نہیں کر سکتی۔ جو جماعت اپنے عمل سے یہ ثابت کر دے کہ وہ "بزنس" کے لیے نہیں بلکہ خدمت کے لیے نمودار ہوئی ہے، پیٹ کے لیے نہیں بلکہ دل و دماغ کے لیے میدان میں آئی ہے، ظالم بننے کے لیے نہیں بلکہ ظالموں کا سدباب کرنے کے لیے وجود پذیر ہوئی ہے وہ اگر لحاظِ تعداد صرف دو افراد پر بھی مبنی ہو اور اس کے مقابلہ میں چالیس کروڑ باشندوں کی متحدہ قوت بھی زور آزما ہو تو بھی اس کی شکست سہل نہیں، بلکہ اس کی فتح اللہ کے ہاں مقدر ہو جاتی ہے، چاہے خود اس کے روبرو ظاہر ہو یا اس کے بعد میں آنے والی کسی وارث طاقت کے ہاتھوں تکمیل پائے ـــــ کیونکہ حق و عدل کی حمایت میں کھڑے ہونے کے معنی یہ ہیں کہ خود خدا کی قوتیں پشت پناہی کرنے والی ہیں اور حق و عدل کی مخالفت کرنے والے ایک صالح جماعت سے نہیں بلکہ خود خدا کی تقدیر سے لڑتے ہیں۔ اس فلسفہ کی روشنی میں آپ خود سوچ کر فیصلہ کیجیے کہ مسلمان کیا کسی ایسے ہی موقف پر کھڑے ہیں یا اس کے بخلاف کسی مادہ پرستانہ اور قوم پرستانہ مقصد پر قوتیں صرف کر رہے ہیں؟ پھر کیا وجہ ہے کہ روپے اور عہدوں اور اختیارات کی لڑائی لڑتے ہوئے جب یہ کسی طاقتور قوم سے چپت کھا جائیں تو اسلام کا واسطہ دیں کہ ہم صرف اس وجہ سے ظلم سہہ رہے ہیں کہ خدا و رسول پر ایمان رکھتے ہیں؟ آخر یہاں خدا پرستی کا اور اخلاقِ اسلامی کا اور دعوت الی الحق کا اور خدمتِ انسانیت کا کونسا ایسا مظاہرہ تم نے کیا ہے جس کی بنا پر بے قصور مظلومیت کی داستان سنائی جا سکے؟ اگر مجرد ان کا دین اسلام پر ایمان رکھنا وجہ فساد ہوتا تو اس کے لازمی آثار یہی ہو سکتے تھے کہ انھوں نے اپنے ماحول میں

زبان اور عمل سے مسلسل اس چیز کی طرف دعوت دی ہوتی جس پر وہ ایمان رکھتے تھے، اور پھر اس دعوت کے زیر اثر غیر مسلموں کو اصل نفرت اس چیز سے پیدا ہو جاتی اور وہ اس کی روک تھام کے لیے داعیوں پر ظلم ڈھاتے۔ مگر یہاں اس قسم کی کوئی بات بھی نہیں ہے۔ بلکہ بہار کے ہندوؤں نے مسلمانانِ بہار کو ایک ایسی حریف قوم کے افراد سمجھا ہے جو ان کی اپنی قوم کے خلاف سیاسی اور معاشی میدانوں میں کشمکش کر رہی ہے۔

"ما لکم لا تقاتلون" کا خطاب نبی صلعم کی اس جماعتِ مقدسہ سے تھا جو ان تمام شرائط کو پورا کر چکی تھی جو قتال کے لیے لازمی ہیں۔ جیسا کہ یہ بات ہماری طرف سے پہلے بھی واضح کی جا چکی ہے کہ آغازِ قتال کے لیے شرعاً کچھ شرائط کا پورا کر لینا واجب ہے۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ جماعتِ صالحہ وجود میں آ چکی ہو، دوسری یہ کہ وہ جماعت دورِ دعوت الی الحق کو عبور کر چکی ہو اور اب اتمامِ حجت کے بعد تلوار سنبھالے، تیسری یہ کہ وہ ایک با اختیار امارت کے تحت ہو، یعنی ایسی امارت جس کے اوپر کوئی با اقتدار قوت اللہ کے سوا موجود نہ ہو۔ نبی صلعم کی جماعت مدنی دور میں پہنچ کر ان جملہ شرائط کو پورا کر چکی تھی، لیکن آپ جنھوں نے ان شرائط میں سے کسی شرط کو بھی پورا نہیں کیا ہے، اپنے آپ کو کس طرح اس حکم کا مخاطب بنا سکتے ہیں، اور ان شرائط کو پورا کیے بغیر قتال کا آغاز کرنا محض فساد فی الارض ہے، اور کچھ نہیں۔

اس کے ہم بھی قائل نہیں کہ قتال کے لیے مادی قوتوں کی کوئی حد بندی شریعت میں کی گئی ہے، بلکہ جتنی قوت بھی مہیا ہو سکے اسی کو اللہ کے بھروسہ پر کافی سمجھ کر حکمت سے صرف کیا جا سکتا ہے۔ اور معرکۂ بدر کا سا مجاہدانہ اقدام بھی کیا جا سکتا ہے، مگر کم از کم مندرجہ بالا شرائط کو پورا کرنا ضروری ہے اور غازیانِ بدر انھیں پورا کر کے میدان میں آئے تھے۔

آپ کا یہ ارشاد بھی بجا کہ صالح جماعت کے لیے یہ لازم نہیں کہ وہ ہر پہلو سے مرتبۂ سابقون الاولون کو پہنچ چکی ہو، مگر قتال کے لیے کسی جماعت کے جماعتِ صالحہ ہونے کی جو کم سے کم شرائط ہیں، موجودہ احوال میں ہم میں وہ بھی نہیں پائی جاتیں۔ ہم دورِ دعوت میں ہیں اور ہماری بیچارگیوں کا عالم یہ ہے کہ شریعت کے بعض اجزاء پر تو ہم عمل پیرا ہو سکتے ہیں مگر دوسرے بہت سے اجزاء میں نظامِ طاغوت کے تسلط کی وجہ سے ہم اضطراری رخصتوں سے فائدہ اٹھانے پر مجبور ہیں اور بہت سی آلودگیاں ہمیں بالجبر گھیرے

ہوسکے ہیں۔ اس سال میں ہم بارہ اور تو ضرور جماعت بنا چکے ہیں، مگر بفضل تعالیٰ ہم پوری طرح جماعت صالحہ نہیں بن سکے اور جماعت صالحہ ہونے کی حیثیت سے جو فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں ان کی ادائیگی بھی ابھی ناقص ہے۔ ہم نے دعوت اقامت دین کا فریضہ کما حقہ ادا نہیں کیا ہے اور جس حد تک حق کا پیغام اتمام حجت کے لیے ہمیں ہندستان کے گوشے گوشے میں پہنچانا چاہیے اور جس تسلسل سے ہمیں اپنے عمل سے دین اسلام کے حق ہونے کی شہادت دینی چاہیے، اس کا عشر عشیر بھی اتمام پذیر نہیں ہوا۔ پھر ہمیں کیا حق ہے کہ وقت سے پہلے اپنے حق کی شہادت تلوار سے دینا شروع کر دیں۔ جس طبیب نے سوسائٹی کے پھوڑوں کا علاج مرہم سے ادا نہ کیا ہو اور علاج پورا نہ کیا ہو، اس کا یہ کام نہیں ہے کہ وہ اس کے اعضا کی قطع و برید شروع کر دے۔ یہ تو خدا کے بندوں پر ظلم ہوگا اور اس ظلم کا حساب خدا کی عدالت میں دینا پڑے گا۔

باقی رہا یہ امر کہ کب یہ شرائط تمام پوری ہوں گی اور کب یہ دور ختم ہوگا سو اس معاملہ میں ہم کوئی تخمینہ نہیں لگا سکتے۔ یہ معلوم نہیں کر سکتے کہ اللہ کی مشیت کب ہماری مساعی کو تکمیل تک پہنچائے گی۔ اتنی بات البتہ ہم جانتے ہیں کہ دیر ہوگی تو بہرحال ہماری سستی کاہلی سے ہوگی، ورنہ اللہ کی رحمت ہر وقت مساعی کا حساب چکانے کو تیار رہتی ہے۔ پس ہمارا کام یہ ہے کہ دعوت کے فرائض کی انجام دہی میں سرتوڑ کوشش کریں اور آئندہ کے مراحل کی سوچ میں لگنے کے بجائے موجودہ مرحلہ کو طے کرنے کی فکر کریں۔

زکوٰۃ کی وصولی وصرف کا اجتماعی نظام

سوال: جماعت اسلامی اس وقت الجماعۃ کی حیثیت رکھتی ہے یا نہیں؟ اگر نہیں ہے تو مجلس شوریٰ کا یہ فیصلہ کہ ارکان جماعت اپنی زکوٰۃ لازماً جماعت کے بیت المال میں داخل کریں کس بنا پر ہے؟ یہ حکم کسی نص پر مبنی ہے یا ایک اجتہادی فیصلہ ہے؟ اگر چند مسلمان مل کر کسی شخص کو اپنا امیر بنا لیں، لیکن شرعاً اس کا مقام امیرالمومنین کا مقام نہ ہو تو کیسے یہ فیصلہ ہو سکتا ہے کہ ہر شخص کو زکوٰۃ بیت المال میں داخل کرنا واجب ہے؟ کیا اس فیصلہ کے بعد انفرادی طور پر کسی رکن کے زکوٰۃ نکالنے سے فرض پورا نہیں ہوگا؟

یہ بات بھی واضح فرمادیں کہ خلیفۂ اول رضی اللہ عنہ نے مانعین زکوٰۃ کے خلاف فیصلۂ جہاد دیتے وقت یہ جو فرمایا تھا کہ اگر یہ لوگ اس زکوٰۃ میں سے جو دورِ نبوی میں دیتے رہے ہیں اونٹ باندھنے کی ایک رسی بھی روکیں گے تو میں ان پر تلوار اٹھاؤں گا۔ کیا اس کا مدعا یہ تھا کہ اگر وہ لوگ نفس زکوٰۃ دینے سے انکار نہ کرتے اور اس میں سے کچھ حصہ انفرادی طور پر ادا کر کے خلیفۃ المسلمین کو پورا صدقہ نہ سپرد کرتے تو پھر بھی ان کے خلاف جہاد کیا جاتا؟

[illegible] یہ معلوم ہے کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں جب اموال زیادہ ہو گئے تو اجماع صحابہ رضی اللہ عنہم یہ فیصلہ ہوا کہ لوگ باطن خود زکوٰۃ ادا کریں۔ سوال یہ ہے کہ اگر زکوٰۃ کی ادائی اجتماعی نظم سے لازماً متعلق ہوتی تو عین خلافت راشدہ کے دوران میں ایسے فیصلہ کی کیا توجیہ ہوتی؟

جواب:- ہم بالفعل تو "الجماعت" نہیں ہیں، کیونکہ ہم کو سیاسی قوت حاصل نہیں ہے لیکن بالارادہ الجماعۃ ہیں۔ ہم اپنے ارکان سے اس وقت اطاعت کا جو مطالبہ کرتے ہیں وہ اس عہد کی بنا پر ہے جو انھوں نے نظم جماعت کے اندر رہنے اور اپنے منتخب کیے ہوئے امیر کے ان فیصلوں کی پابندی کرنے کے لیے کیا ہے، جو فیصلے کتاب و سنت کی حدود کے اندر اور خدا و رسول کی رضا کے مطابق ہوں۔ اس عہد کو نباہنے کے وہ شرعاً ذمہ دار ہیں۔

ہمارے نزدیک جو فرائض جماعتی نظم کے تحت انجام پانے چاہییں ان کو انفرادی طور پر انجام دینا جائز نہیں ہے، جبکہ جماعت صالحہ موجود ہو ـــــ اگرچہ اس کی حیثیت معیاری جماعت کی نہ ہو۔ زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کے متعلق یہ حقیقت بالکل واضح ہے کہ وہ ایک صالح اجتماعی نظم کی مقتضی ہے۔

خلیفۂ اول نے جن مانعین زکوٰۃ کے خلاف جہاد کا اعلان فرمایا تھا، وہ کوئی ایک ہی قسم کے لوگ نہیں تھے، بلکہ کچھ تو ایسے مرتدین تھے جو زکوٰۃ کے ساتھ ساتھ پورے دین کا قلادہ گردنوں سے اتار چکے تھے، اور کچھ وہ تھے جو زکوٰۃ روکنا چاہتے تھے اور ایک گروہ ایسے لوگوں کا تھا جو سارے دین کو قائم رکھنا چاہتے تھے اور زکوٰۃ بھی دینے کے منکر نہیں تھے، مگر ان کا کہنا یہ تھا کہ ہم اپنی زکوٰۃ علیحدہ خود جمع و خرچ کریں گے۔ ابوبکرؓ کے

عاملوں کو نہیں دیں گے۔ ایسے ہی لوگوں کا قول تھا کہ :۔

اطعنا رسول اللہ اذا کان بیننا فوا عجبا ما بال ملک ابوبکر

یعنی جب تک رسول اللہ ہمارے درمیان رہے، ہم نے ان کی اطاعت کی، مگر یا للعجب! ابوبکر کی حکومت کیا حیثیت رکھتی ہے! ان کی بنائے اختلاف یہ تھی کہ رسول اللہ کے بعد جو نظام خلافت قائم ہو اسے یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ نبی کی طرح مسلمانوں کو ایک سیاسی مرکز سے وابستہ رکھے۔ ہم رسول کو اگر اپنے صدقات کے نظام تحصیل و تقسیم کا مرکز مانتے تھے تو اس لیے کہ وہ رسول تھا، مگر اس کے بعد کے لوگوں کو ہم یہ حیثیت نہیں دیتے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان تینوں گروہوں کے متعلق الگ الگ توضیح بھی فرما دی۔ پہلے گروہ کے متعلق تو مجاہدین کے مختلف کمانڈروں کو جو فرمان عام لکھ دیا گیا تھا اس میں یہ ہدایت دی گئی تھی کہ مرتدین میں سے جو لوگ دوبارہ اسلام قبول کرلیں اور اس کے اعلان کے طور پر اپنی بستیوں میں اذان پکاریں ان سے جنگ نہ کی جائے اور جن بستیوں سے اسلام قبول کرنے کا یہ اعلان نہ ہو وہاں کے باشندوں سے پوچھا جائے کہ یہ اعلان کیوں نہیں کیا گیا، پھر اگر وہ ارتداد پر قائم رہیں تو ان کی بستیوں کو نیست و نابود کر دیا جائے۔ دوسرے گروہ کے متعلق جو مسلمان رہ کر زکوٰۃ دینے سے انکاری تھا، خلیفۂ اول نے فیصلہ دیا کہ واللہ لاقاتلن من فرق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ۔ اور تیسرے گروہ کے متعلق بھی بالتصریح یہ ارشاد فرمایا کہ اس زکوٰۃ میں سے جسے یہ لوگ رسول اللہ کو دیا کرتے تھے، اگر اونٹ باندھنے کی ایک رسی بھی روکیں گے تو ان کے خلاف جنگ کی جائے گی۔ زکوٰۃ کو بالکل روکنے کے معنی اللہ کے حق کو غصب کرنا ہے اور بیت المال کے ذریعے ادا کرنے کے بجائے انفرادی طور پر ادا کرنا بیت المال کا ایک حق مارنا ہے۔ یہ دونوں رویے ایسے ہیں جن کو روکنے کے لیے جماعت اسلامی جہاد کرسکتی ہے۔

ردّالمحتار کی جس بات کا حوالہ آپ نے دیا ہے اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ زکوٰۃ کی تقسیم کا معاملہ سرے سے جماعتی نظم سے تعلق ہی نہیں رکھتا، بلکہ الٹا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ لوگ اپنی زکوٰۃ انفرادی طور پر نکالنے اور تقسیم کرنے کے صرف اس صورت میں مجاز ہو سکتے ہیں جب کہ امیر کی طرف سے ان کو مجاز کیا جائے۔ نیز حضرت عثمانؓ کے اس فیصلہ سے یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ زکوٰۃ کی اجتماعی تحصیل

اور اس کے اجتماعی صرف کا نظام قیامت تک کے لیے منسوخ ہو گیا۔ مگر ان کے اس فیصلہ کا تعلق ان کے اپنے عہد اور بعد کے اس دور تک سے ہے جس میں جماعت کی رائے میں اس نظم کا دوبارہ قیام مشکل تھا۔ بہرحال نظام جماعت کا کوئی ایسا جز جس کا شریعت تقاضا کرتی ہو، عارضی ضرورتوں اور مصلحتوں کی بنا پر عارضی طور پر معطل تو ہو سکتا ہے لیکن کسی کے منسوخ کرنے سے دائمی طور پر منسوخ نہیں ہو سکتا۔

خدا کی صفتِ خلق کی حقیقت

سوال:۔ ہمارے مذہب اسلام کے بارے میں ایک شبہہ ہے، اسے رفع فرما دیں تو بہت سے غیر مسلموں کے لیے مفید ہو گا۔ قرآن میں ہے کہ خدا جب کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے تو کہتا ہے کہ "کن" یعنی "ہو جا" تو وہ صرف اس کن کے حکم سے ہو جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ خدا کا محض حکم کیونکر دنیا کو بنا سکتا ہے؟ آخر یہ حکم کسے دیا گیا؟ کون ہو گیا؟ ہمیں اس پر تعجب ہے کہ مسلمان خدا کے سوا کسی اور شے کو قدیم نہیں مانتے، اور کہتے ہیں کہ یونہی خدا نے دنیا پیدا کر دی۔ ہم لوگ تو مادہ، جیو، پرماتما تین چیزوں کو قدیم مانتے ہیں، اور پرماتما نے اسی مادہ اور جیو سے دنیا بنائی ہے۔

جواب:۔ خدا کی ہستی کے بارے میں کوئی بات سوچتے وقت یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ خدا بھی کوئی انسان کی طرح کی ہستی ہے کہ اسے جب کوئی چیز بنانی ہو تو وہ مسالے کا محتاج ہو، اور اوزاروں کا ضرورت مند ہو اور ہاتھ پاؤں سے کام لینے پر مجبور ہو۔ خدا کے متعلق جتنی غلط باتیں لوگوں میں پھیلی ہوئی ہیں وہ صرف اس وجہ سے ہیں کہ عام طور پر خدا کو آدمی کی طرح سمجھا جاتا ہے، حالانکہ آدمی محتاج ہے اور خدا محتاج نہیں۔ خدا تو خدا اسی وجہ سے ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہیں اور سب اس کے محتاج ہیں۔ وہ کوئی شے بنانے کے لیے اس بات کی حاجت نہیں رکھتا کہ کچھ ضروری مسالہ اسے کہیں سے پڑا ہوا مل جائے یا کوئی دوسرا اس کو کہیں سے ضروری سامان لا دے اور پھر وہ اس کی شکلیں بدلتا رہے۔ مثلاً مٹی کو وہ خود پیدا نہ کر سکے بلکہ کہیں سے مٹی مل جائے تو اس کی زمین بنا دے، پتھر وہ پیدا نہ کر سکے، مگر پتھر کہیں سے مل جائیں تو انھیں

جمع کرکے پہاڑ بنا دے، لکڑی خود نہ بنا سکے مگر لکڑی اگر ہاتھ لگ جائے تو اس کی میز کرسیاں کاٹ لے اور پیدا نہ کرسکے، مگر کوئی اسے لا دے تو وہ اسے ڈھال کر برتن کی شکل میں، برتن اور کرسی ایسی بنا سکے؛ یہ حالت تو آدمی کی ہے کہ وہ مسالہ خود نہیں بنا سکتا مگر مسالہ مل جائے تو اس کی مختلف ضروری چیزیں بنا لیتا ہے۔ خدا اور آدمی کے پیدا کرنے میں فرق یہی ہے کہ خدا مسالہ تک بھی آپ بنا سکتا ہے اور اس کی شکلیں بھی خود بدل لیتا ہے، مگر آدمی ایک حد تک مسالہ کی شکلیں تو بدل لیتا ہے لیکن مسالہ خود نہیں بنا سکتا۔

دوسری بات کہ "کن" کس طرح کہا گیا اور کس سے کہا گیا؟ اس کے جواب میں بھی پھر وہی بات عرض کرنا پڑے گی کہ خدا کا "کن" کہنا آدمی کے کہنے کی طرح نہیں ہوتا، بلکہ دراصل یہ بھی ایک حقیقت کو انسانوں کے سمجھانے کے لیے اس طریقہ سے بیان کیا ہے کہ انھیں بات سادہ طریقے سے سمجھ میں آسکے اور وہ حقیقت صرف یہ ہے کہ خدا جب چاہتا ہے کہ کسی شے کو پیدا کرے یا بنائے تو اسے مسالے کی اور اوزاروں کی کچھ ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ اس کا ارادہ کر لینا ہی اس کے لیے کافی ہے۔ وہ جب چاہے جھٹ سے کسی شے کو نہ ہونے کی حالت سے نکال کر ہونے کی حالت میں لے آئے، اور جب چاہے ہونے کی حالت سے پھر نہ ہونے کی حالت میں لوٹا دے۔

یہ دنیا جس میں ہم رہتے ہیں ایسے صاف ستھرے انتظام سے قائم ہے اور اس کی ہر چیز ایسے پکے قانونوں پر چل رہی ہے کہ اسے دیکھ کر آدمی کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسے کس ہستی نے بنایا اور کون اسے باقاعدگی سے چلا رہا ہے، کس کے حکم سے پانی اور ہوا اور بادل اور زمین اور چاند اور تارے مل جل کر کام کر رہے ہیں اور کسی کی مجال نہیں کہ ٹھیک طریقے کو چھوڑ کر کسی قسم کی گڑبڑ مچائے۔ ہر چیز نپی تلی ہے، حساب کے ساتھ بنی ہوئی ہے، قاعدہ اور ڈھنگ سے بڑھتی اور گھٹتی ہے۔۔۔ آخر یہ کس کی بادشاہی اور کس کا انتظام ہے؟ اس کے بہت سے غلط سلط جواب لوگوں نے سوچے ہیں مگر اسلام اس کا جو جواب دیتا ہے یہ دنیا بھی اسی جواب کی گواہی دیتی ہے۔ یعنی یہ کہ اس دنیا کو بنانے والا کوئی ایسا ہے جو ذرے سے لے کر سورج تک ہر شے پر پورا قابو رکھتا ہے، ہر شے کا علم رکھتا ہے، ہر شے کے قانون قاعدے بنانے والا ہے ۔۔۔ اور یہ اس وجہ سے کہ وہی سب کا پیدا کرنے والا ہے۔

لیکن یہ کہنا کہ مادہ خود بن گیا اور جتنی ضرورت تھی اتنا ہی بنا اور جن جن کاموں کے لیے آگے چل کر اس کی ضرورت پیش آئی تھی ٹھیک ٹھیک انھیں کے لیے بنا اور اسی طرح روحیں بھی ایک خاص حساب سے بن گئیں اور جیسے جسم ان کو آگے چل کر ملنے جننے والے تھے انھیں کے مطابق ان میں مختلف طاقتیں بھی خود بخود ایک انتظام کے ساتھ بھر گئیں تو پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ بیچ میں آ کے خدا کی ضرورت کیا پیش آتی ہے۔ جیسے اور باتیں خود ہو گئیں روحوں کا اور مادے کا جوڑ بھی خود ہی لگ جانا چاہیے تھا۔ اس طرح کی سوچ سوچنے والے لوگ آخر کار خدا کا انکار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ آخر تین ازلی وجود ماننا زیادہ عقلی بات ہے یا ایک ہستی کو قائم و دائم ماننا زیادہ دانائی کی بات ہے؟ سیدھی بات یہ ہے کہ خدا کو ماننا ہو اور درحقیقت ایک سمجھدار آدمی اسے ماننے پر فطرۃً مجبور ہے تو اسے پورے اختیار والا، طاقت والا اور بنانے مٹانے والا خدا مانا جائے لیکن ایک محتاج اور بے بس ہستی کو جو ایک تنکا بھی خود پیدا نہ کر سکے، خدا ماننے سے حاصل کیا ہے؟ ایسے خدا کو ماننے سے تو وہ سوال حل نہیں ہوتا جو ہر انسان کے دل کا پہلا سوال ہے:

آخر میں یہ بات مخلصانہ مشورہ کے طور پر عرض کر دوں کہ اگر آپ فی الحقیقت سچائی کی تلاش کا جذبہ رکھتے ہیں اور اپنی زندگی کو سچ کی بنیاد پر کھڑا کرنا چاہتے ہیں تو یہ مناسب نہیں ہے کہ کسی دین یا مذہب یا فلسفے کو پوری طرح دیکھنے کے بجائے آپ بیچ میں سے اس کا کوئی ٹکڑا نکال لیں اور اس پر سوچنے لگیں۔ اسلام کے متعلق کوئی رائے قائم کرنا چاہیں تو اسلام کو ایک ڈھنگ سے پڑھ جائیں اور پھر سوچیں۔ اس معاملہ میں آپ کی امداد کے لیے ہم آپ کو اپنے ہاں کے لٹریچر میں سے "سلامتی کا راستہ"، "دین حق"، "اسلام اور جاہلیت"، اور "رسالہ دینیات" پڑھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔

عصمت کی حفاظت کے لیے خودکشی

سوال:۔ بہار کے خونیں ہنگامہ کے دردناک واقعات معلوم کر کر کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یوں تو ہر ستم جو توڑا جا رہا ہے قیامت سے کم نہیں مگر خصوصیت سے مسلمان عورتوں کی آبرو اور عصمت پر جو حملے کیے جاتے ہیں وہ کسی بھی درجہ میں قابل برداشت نہیں ہیں۔ مسلمان

عورتوں کو بوٹیاں دے دے کے بدمعاش ایک دوسرے کے ہاتھ نیلام کرتے ہیں اور کبھی برسرِعام انھیں برہنہ کر دیا جاتا ہے۔ اس حال میں بعض شرفا کی عورتوں نے اپنی عصمتوں کی حفاظت کے لیے چھتوں سے کود کر یا کنوئیں میں گر کر جانیں دیدی ہیں۔ یہ میرا آنکھوں دیکھا واقعہ ہے کہ ایک اعلیٰ گھرانہ پر جب اشرار کا حملہ ہوا تو صاحبِ خانہ نے گھر کی چھوٹی بڑی ساری عورتوں کو صحن کے کنوئیں میں گر کر مر جانے کا حکم دیا، ور مستورات نے اس کی تعمیل کی، اس کے بعد صاحبِ خانہ بدمعاشوں کے غول کے سامنے تنہا مقابلہ کے لیے ڈٹ گئے اور پنتیس کی جان لے چکنے کے بعد خود بھی شہید ہو گئے۔ اب دریافت طلب امر یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ ہم کو بھی یہی حالت پیش آجائے تو کیا یہی طریقہ اختیار کرنا مناسب ہوگا؟

جواب: جن مستورات نے اس طریق سے جانیں دی ہیں، ان کے متعلق تو کوئی کلام کرنا ہمارا کام نہیں ہے، ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے اور وہی بہتر جانتا ہے کہ ان کا اس طرح مرنا کیا نتائج رکھتا ہے خدا ان کی مغفرت فرمائے۔ اصولاً ہمیں یہ معلوم ہے کہ خودکشی کی موت مرد اور عورت دونوں کے لیے ممنوع قرار دی گئی ہے۔ جس واقعہ کا آپ نے ذکر کیا ہے، اس میں جو صورت خود صاحبِ خانہ نے اختیار کی تھی۔ دراصل وہی گھر کی مستورات کے لیے بھی صحیح تھی۔ اسلام کا تقاضا مسلمان مردوں کی طرح مسلمان عورتوں کے لیے بھی یہی ہے کہ وہ جان یا مال یا عصمت پر حملہ کرنے والے دشمن کی پوری قوت سے مزاحمت کریں، چاہے ان کی قوت کتنی ہی کم ہو اور مقابلہ کی جو بھی صورت اختیار کرنی ممکن ہو، اسے اختیار کریں، تاآنکہ ان کی زندگیاں ختم ہو جائیں یا وہ دوسروں کے پنجۂ ظلم میں اسیر و بے بس ہو کے رہ جائیں۔ قوت اور تدبیر دونوں کے ذریعہ پورا مقابلہ کرنے کے بعد اگر کوئی عورت کسی بدمعاش کے ہاتھ سے اپنی آبرو نہ بچا سکے تو عنداللہ وہ بری الذمہ ہے اور اگر حملہ آور کے ہاتھ سے اس کی موت واقع ہو جائے تو وہ شہید ہے۔

اسلام جہاں اس پر زور دیتا ہے کہ دوسروں پر دست تعدی دراز نہ کیا جائے وہاں وہ یہ مطالبہ بھی کرتا ہے کہ اگر کوئی ظالم آپ پر حملہ آور ہو تو اس کا مقابلہ کرنے میں قوت کی آخری رمق تک صرف کی جائے۔ اس کے بعد اگر کوئی زیادتی ہوتی ہے تو معذوری اور بے بسی ہے۔ یہ مطالبہ مرد اور عورت، بوڑھے اور جوان،

سبھی کے لیے یکساں ہے، اور کسی کو یہ اجازت نہیں کہ اس مطالبہ سے کترا کے خودکشی کرلے۔

شیطانی وساوس

سوال: چند روز سے میرے ذہن میں ایسے ایسے لغو خیالات آ رہے ہیں جن سے خود میری طبیعت کو شدید تکلیف ہوتی ہے مگر میں ان سے کسی طرح نجات نہیں پا رہا ہوں اور بہت پریشان ہوں۔ خدا کی عبادت کرتے ہوئے اور خدا سے دعا مانگتے ہوئے جب ذات باری تعالیٰ کی طرف دھیان جاتا ہے تو خدا تعالیٰ کی شان کے خلاف ناقابل بیان خیالات دماغ سے ابھرنے لگتے ہیں، مثلاً نعوذ باللہ ایک خیال آیا کہ خدا فلاں برائی کر سکتا ہے — حالانکہ میرا دل ایمان کی روشنی سے منور ہو چکا ہے اور میں اللہ تعالیٰ کی جملہ پاکیزہ صفات پر یقین رکھتا ہوں۔ بہرحال ایسے خیالات کے آنے پر استغفار پڑھتا ہوں، اور پھر یہ غائب ہو جاتے ہیں، مگر کچھ دیر بعد پھر ان کا اعادہ ہوتا ہے۔ آخر یہ کیا حالت ہے اور کیوں ہے؟ میں اس پر کیسے قابو پا سکتا ہوں؟

جواب: یہ حالت جس کا آپ نے تذکرہ کیا ہے، کم و بیش ہر اس شخص کو پیش آتی ہے جو غلط راستے پر چلتے چلتے صراطِ مستقیم کی طرف رخ پھیرنا چاہتا ہے۔ درحقیقت جب شیاطین یہ دیکھتے ہیں کہ ان کا کوئی وفادار آلۂ کار ہاتھوں سے جاتا ہے تو وہ اس پر بہت سخت ہلہ بولتے ہیں اور شکوک و شبہات اور متضاد افکار و احساسات کی الجھنوں میں الجھاتے ہیں، حتیٰ کہ عبادات میں بھی کیف و سکون کا کوئی عنصر باقی نہیں رہنے دیتے، تاکہ سٹپٹا کے وہ شخص پھر ٹیڑھے راستے پر چلنے لگے۔

خود صحابہ کرام کو اس قسم کے مکروہ وساوس کے خلاف شکایت پیدا ہوئی تھی اور یہ سوال نبی صلعم کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے توضیح فرما دی کہ ان وساوس پر اگر آدمی متنبہ ہو جاتا ہے اور محسوس کر لیتا ہے اور وہ انھیں نوچ کے الگ کرتا رہتا ہے تو پھر یہ ایمان کی علامت ہے۔ کافر کے دل میں اور مومن کے دل میں فرق یہی ہے کہ کافر کا دل یا تو بنجر ہوتا ہے اور یا پھر جنگل کی طرح ہر شے اس میں اگتی اور

بڑھتی چلی جاتی ہے، نہ کوئی نگرانی کا سامان ہوتا ہے، نہ کانٹ چھانٹ کا اہتمام، مگر مومن کا دلِ زندہ بہت حساس بھی ہوتا ہے اور اس کے ساتھ اس کا احساس فضول اور مضر جڑی بوٹیوں کو چھانٹتا بھی جاتا ہے اور مفید پودوں کی آبیاری اور حفاظت کا خاص اہتمام بھی رکھتا ہے۔ اس طرح افکار و اعمال صالحہ کا ایک خوشنما چمن زار تیار ہو جاتا ہے۔

پس آپ اس کا اہتمام کیجیے کہ جو اچھا خیال ذہن میں آئے اسے دیر تک روک رکھیے اور دل میں جذب کر لیجیے اور اپنے اعمال میں اسے ساری کر لینے کی سعی کرتے رہیے اور جو برا خیال سامنے آئے اسے نفرت کے ساتھ دماغ سے نکال پھینکیے اور اعمال پر اثر انداز ہونے سے روکیے۔ نیز شیطان جب بھی وسوسہ اندازی کرے تو اپنے آپ کو اس کے مقابلہ میں خدا کی پناہ میں دیجیے اور خدا کے ذکر کے ساتھ خدا کی صفات اعلیٰ کا تصور ذہن میں استوار کیجیے۔ نماز اور انفاق فی سبیل اللہ اور اقامتِ دین کی مساعی میں جتنا جتنا انہماک آپ بڑھاتے جائیں گے، ان شاء اللہ اتنا ہی اتنا آپ کا قلب وساوسِ شیطانی سے محفوظ ہوتا جائے گا۔ یہ چیز بھی بڑی حد تک موثر ہو سکتی ہے کہ آپ بری سوسائٹی اور برے ماحول سے بچیں اور اچھی سوسائٹی اور اچھا ماحول اپنے لیے تلاش کریں۔

جماعتِ صالحہ میں فقہی اختلافات کی جائز حدود

سوال:- روداد جماعت اسلامی حصہ اول کے صفحہ ۱۰ پر لکھا ہوا ہے کہ "ہم سب جزئیات و فروع میں اختلاف رکھتے ہوئے اور ایک دوسرے کے بالمقابل بحث و استدلال کرتے ہوئے بھی ایک جماعت بن کر رہ سکتے ہیں۔" سوال یہ ہے کہ کیا کسی مختلف فیہ مسئلہ میں اگر مجلس شوریٰ یا امیر جماعت کسی امر جزئی کو جماعت کے لیے لازم قرار دے دے تو ایک رکن جماعت کو اختیار ہے کہ وہ اس کے علی الرغم اپنی رائے پر عمل کرتا رہے ـــــ خصوصاً اس صورت میں جب کہ امیر جماعت یا مجلس شوریٰ کے فیصلہ کی تائید میں کوئی نص صریح موجود نہ ہو۔

دوسری دریافت طلب چیز یہ ہے کہ ایک شخص اگر امام ابو حنیفہؒ اور دوسرے فقہائے حنفیہ

کی تقلید اُس حد کے اندر کرنا چاہتا ہو جہاں تک ان ائمہ کے فیصلے کسی نص سے متعارض نہ ہوں اور اجتہاد سلف کو وہ موجودہ زمانہ کے اجتہادات پر ترجیح دیتا ہو، تو کیا اسے جماعت اسلامی میں اس کے مسلک میں کوئی رکاوٹ ڈالے بغیر لیا جا سکتا ہے؟

جواب: ۔ تمام اجتماعی اور سیاسی مسائل میں ہر رکن کے لیے امیر جماعت اور شوریٰ کے فیصلوں کی پابندی لازمی ہے، اگرچہ وہ رائے کی حد تک ایسے فیصلوں سے اختلاف کر سکتے ہیں اور کوئی مختلف مسلک بربنائے اجتہاد نظری طور پر پسند کر سکتے ہیں۔ عمل میں اجتہادی اختلاف صرف ان امور میں رکھا جا سکتا ہے جن کی کسی مستقل شکل کا پوری جماعت کے لیے متعین کر دینا اور جنھیں جماعتی نظم یا پالیسی کا ایک جزو بنا دینا ضروری نہ ہو۔ مثلاً رفع یدین، آمین بالجہر، جرابوں پر مسح کرنے نہ کرنے میں لوگ آزاد ہیں لیکن وہ مسائل جو براہ راست جماعت کے اجتماعی نظام اور اس کے پروگرام سے متعلق ہوں، ان میں بہرحال امیر جماعت کا فیصلہ سب کے لیے واجب القبول ہوگا اور رایوں کے اختلاف کے باوجود اس کا عملی اتباع کیا جائے گا۔

سوال کے دوسرے جز کے جواب میں واضح رہے کہ اگر کوئی شخص کسی امام کا پیرو ما وافق الکتاب والسنۃ کی حد تک ہے اور اسی حد تک وہ اجتہادات سلف کا بھی پابند ہے، اس کے لیے جماعت کے ساتھ چلنے میں کوئی روک نہیں ہے۔ بشرطیکہ وہ خلف کے [illegible] کو حرام [illegible] ہو اور اجتہادی اختلافات کو کشادہ دلی سے گوارا کر سکے۔

موجودہ ہڑتالیں اور حق پسند مسلمان

سوال: ۔ موجودہ نظام میں کمزور مظلومین کے مطالبات کو منوانے میں ہڑتال ایک کامیاب حربہ ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ شریعت اسلامی بھی کیا اس حربہ کو جائز تسلیم کرتی ہے؟ اس اصولی سوال کے ساتھ یہ بھی معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے کچھ لوگ اپنے محکمہ کے کارکنوں کی ایک ہڑتال میں باقاعدہ شرکت کر چکے ہیں۔ یہ شرکت اس حلفیہ عہد نامہ کے ساتھ تھی کہ ہڑتالی یونین جب تک اجازت نہ دے گی کام شروع نہ کیا جائے گا۔ اب ہڑتال ہونے کا اثر یہ ہوا کہ حکومت نے معقول اضافہ مشاہروں

میں کر دیا، مگر پھر بھی ہڑتالی یونین نے ہڑتال ختم نہیں کی، بلکہ مطالبات اور زیادہ بڑھا دیے۔ اس حال میں بعض لوگوں نے ہڑتال کا جاری رکھنا خلافِ انصاف و دیانت سمجھ کر یونین کے پروگرام سے بے تعلقی کا فیصلہ کر لیا، اور کام شروع کر دیا۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ رویہ اس حلف نامہ کے خلاف ضرور ہے، اور اسی وجہ سے ایسے لوگوں کو غدار، بے ایمان، و عہد شکن وغیرہ کہا جا رہا ہے۔ اگر جماعت اسلامی کے متاثرین اور ہمدردان کو ایسے حالات پیش آ جائیں تو انھیں کیا کرنا چاہیے۔

جواب:- موجودہ نظامِ باطل میں مزدوروں، حکومت کے ملازموں اور عام پبلک کے بالکل ابتدائی حقوق کا بھی کماحقہٗ احترام نہیں پایا جاتا اور نہ لوگوں کی تکالیف کو دور کرنا اور ان کو سہولتیں بہم پہنچانا اس کا منتہا ہے۔ بلکہ ستم یہ کہ مظلومین کے جائز مطالبات جب تک جائز ذرائع سے سامنے آتے ہیں تو ان پر اس نظام کے خداوند کوئی غور کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔ اس وجہ سے اسی نظام کے پرورش کردہ لوگ جواب میں جائز مطالبات کو جائز ذرائع سے پیش کرنے پر اکتفا نہیں کرتے، بلکہ وہ بھی ناجائز مطالبات کو ناجائز ذرائع سے منوانے پر اتر آتے ہیں۔ ان حالات میں ایک سچے مسلمان کی نگاہ میں جزئی مسائل کے لیے ہڑتالیں کرنے نہ کرنے کا سوال کوئی اہمیت نہیں رکھتا، کیونکہ اس کے سامنے تو اس نظام کو ازسرتاپا بدلنے کا سوال در پیش ہے اور اسلام کے علمبرداروں کا اصل مطالبہ اس نظام سے یہ ہے کہ وہ اپنے پرزے سمیٹ کر ایک پاکیزہ اور منصفانہ نظام کے لیے جگہ خالی کر دے۔

جو لوگ حق اور انصاف کے قائل ہیں اور دوسروں کو حق اور انصاف کا قائل کرنا چاہتے ہیں وہ اگر مزدوری یا تنخواہ دار کارکنوں کی پوزیشن میں ہوں تو ان کے لیے لازم ہے کہ وہ پہلے اپنا تشخص الگ قائم کریں اور اپنے آپ کو حق اور انصاف کے حامیوں کی حیثیت سے پوری طرح روشناس کرائیں۔ اس کے بغیر ان کو یہی مشکل پیش آئے گی کہ ان کے عام ہم پیشہ جب کبھی ہنگامے کریں گے اور جائز مطالبوں کے ساتھ ناجائز مطالبے بھی منوانے کی تدبیریں کریں گے تو یا تو وہ ان سے الگ رہ کر مطعون بنیں گے، یا پھر صحیح و غلط ہر کام میں ان کا ساتھ دے کر اپنے اصول و مسلک اور اپنے ضمیر کی خلاف ورزی کریں گے۔ بخلاف اس کے اگر وہ اپنا تشخص قائم کر لیں تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ ابتداءً وہ اس قابل ہوں گے کہ بے انصافی کے مقابلہ میں راستی

اور انصاف کا ساتھ دیں اور بے انصافی کا ساتھ دینے سے انکار کردیں، اور آگے چل کر ان کو حیثیت حاصل ہو جائے گی کہ جو انصاف کو چاہے گا وہ ان کو اپنا پیشوا بنائے گا۔

یہ بات آپ کو خود اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ کسی ایسی ہیئت اجتماعی یا جماعتی تحریک میں جو خدا و رسول کے دین سے آزاد واقع ہوئی ہو، غیر مشروط طور پر حلفیہ عہدناموں کے ساتھ شرکت کرنا ہی فی نفسہ غلط ہے۔ ایسی شرکت کا نتیجہ یہی ہوتا ہے کہ ایک شخص جس رویہ کو انصاف اور امانتداری کی بنا پر اختیار کرتا ہے وہی اس کی غیر مشروط شرکت اور حلفیہ عہد کی وجہ سے بے انصافی اور بے ایمانی بن جاتا ہے۔ ایک غیر دینی تحریک اور نظام کے اندر دیندار آدمی کا کوئی مقام نہیں۔

قواعد ایجنسی

وہ حضرات جو پہلے سے رسالہ ترجمان القرآن کے ایجنٹ ہیں یا اب ایجنسی لینا چاہتے ہیں ان کے لیے قواعد ذیل کی پابندی ضروری ہے:-

(۱) ۵ پرچوں سے کم خریداری پر ایجنسی نہیں دی جاتی۔

(۲) کمیشن کی شرح ۲۵ ٪ بالکل قطعی ہے۔

(۳) ایجنسی کے سلسلہ کے پرچے بک پوسٹ یا رجسٹرڈ روانہ نہیں کیے جا سکتے، بلکہ کمیشن منہا کر کے بقیہ رقم کا وی، پی کیا جائے گا تاکہ حساب صاف رہے۔

(۴) محصول ڈاک میں سے ۵ فی صد ایجنٹ کے ذمہ ہوگا، بقیہ دفتر خود برداشت کرے گا۔

(۵) مطلوبہ پرچوں کی تعداد میں کمی بیشی کی اطلاع ہر مہینہ کے پہلے ہفتہ میں پہنچ جانی چاہیے۔ (مینیجر)

ترجمان القرآن کے پرانے پرچے (دلمبر)

ترجمان القرآن کے فائل مکمل کرنے کے لیے جن اصحاب کو حسب ذیل پرانے پرچوں کی ضرورت ہو، وہ فی پرچہ ۸ر علاوہ محصول ڈاک، کے حساب سے قیمت بھیج کر طلب فرما سکتے ہیں یا وی، پی۔

(۱) ۱۳۵۹ھ:- ماہ رجب۔ ماہ ذی الحجہ۔ (۲) ۱۳۶۲ھ:- جمادی الاولیٰ، جمادی الآخرہ، رجب و شعبان۔ رمضان و شوال (۳) ۱۳۶۳ھ:- ذی القعدہ و ذی الحجہ، (۴) ۱۳۶۴ھ:- ذی القعدہ و ذی الحجہ۔

(۵) ۱۳۶۵ھ:- محرم۔ جمادی الاول۔ جمادی الثانی۔ رجب۔ شعبان۔ رمضان۔ شوال۔ ذی القعدہ ذی الحجہ۔

"مینیجر"

مطبوعات

شمائل الاتقیا مولفہ شیخ دبیر کاشانی خلدآبادی۔ صفحات ۴۶۶۔ قیمت عہ

شائع کردہ:۔ مجلس اشاعت العلوم، محلہ شبلی گنج، مدرسہ نظامیہ، حیدرآباد۔ دکن۔

یہ کتاب اسرارِ تصوف کا ایک بحرِ ذخار ہے۔ اس کے چند حصص کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یونانی اور ایرانی، روحانیاتی فلسفہ کے خمیر سے اس کے مباحث محفوظ نہیں ہیں، مگر اس کے ساتھ اسلام کا جوہر بھی نمایاں ہے۔

افکار و اعمال انسانی کی جو فلاسفی قرآن نے پیش کی ہے۔ وہ اربابِ تصوف کے پیش نظر تو ضرور رہی ہے، مگر اس کو نکتہ آفرینی اور تبویب و تفریع اور اصطلاحات سازی سے اتنا پر اسرار بنا دیا گیا ہے کہ ایک اوسط درجہ کا آدمی فلسفۂ تصوف کو شریعت اسلامی سے ایک جداگانہ چیز اور اسے کسی دوسرے عالم کے اسرار و رموز سمجھتا ہے اور اسے جاننے اور اس پر عمل کرنے کی جرأت ہی نہیں کر سکتا۔ یہی اثر شمائل الاتقیا میں بھی موجود ہے! ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ اسلام از خود جب ایک مکمل فلاسفی ہے تو کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس پر اپنی فکری کاوشوں سے مزید اضافے کرے، نیز وہ اپنی ایک حکمت دعوت اور طریق تبلیغ اور فن تشریح و توضیح بھی اپنے ساتھ رکھتا ہے تو اسلام کے کسی داعی کو دعوت اور توضیح کا کوئی خود ساختہ متفلسفانہ انداز ایجاد کر لینا روا نہیں۔

شمائل الاتقیا میں خدا کے دین کی حکمت جس طرح بیان کی گئی ہے۔ اس میں اور چاہے کتنے ہی خواص ہوں، قرآن کے سادہ اور عقلی اسلوب توضیح کا کوئی عکس نہیں پایا جاتا، نہ اس میں دعوت الی الحق کا طرز وہ ہے جو سنت انبیاء سے اخذ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ساڑھے چار سو صفحات کا سمندر عبور کر جانے کے بعد بھی ایک آدمی کے ذہن میں دین کا کوئی سیدھا سادہ تصور پیدا نہیں ہوتا، نہ دین اور زندگی کے

فطری تعلق کی ماہیت واضح ہوتی ہے۔ پس یہ کتاب انھیں حضرات کے لیے نفع بخش ہو گی جو کوچۂ تصوف کی سیر سے مستفید ہوں:

کتاب فارسی زبان میں ہے اور آج سے تقریباً ۲۰ سال پہلے چھپی ہے۔

حقیقت عالم مولفہ چودھری محمد عبدالرحمن صاحب اسسٹنٹ سکریٹری ہز ہائی نس گورنمنٹ جموں وکشمیر۔ قیمت ۱۲ار

تربیت عالم از مولف مذکور۔ قیمت ۶

قیامت از جناب سید محفوظ الحق صاحب علمی۔ قیمت درج نہیں۔

شائع کردہ:۔ بہائی پبلشنگ کمیٹی، پوسٹ بکس ۱۹، نئی دہلی۔

یہ تینوں کتابیں بہائی مذہب کی تشریح کرتی ہیں اور از اول تا آخر "لطائف فکری وروحانی" سے لبریز ہیں۔ مثلاً خدا کے متعلق یہ تصور پیش کیا گیا ہے کہ انسان اسے صرف اسی حد تک جان سکتا ہے کہ وہ جانا نہیں جا سکتا۔ نیز خدا کو کسی صفت سے موصوف کرنا غلط ہے، وہ ذات بلا صفات ہے۔ دنیا ارادۂ الٰہی کے بیج سے اگا ہوا ایک درخت ہے اور انسان اس کا بہترین ظہور ہے۔ دنیا خود انسان کے احساسات وتصورات سے عبارت ہے۔ ذاتِ الٰہی جس طرح ناقابلِ ادراک ہے، اسی طرح رضائے الٰہی کو براہِ راست معلوم نہیں کیا جا سکتا، بلکہ ارادۂ الٰہی انسانیت ہی کے روپ میں اپنے آپ کو واضح کرتا ہے۔

پھر بہائی فلاسفی یہ دعویٰ رکھتی ہے کہ سلسلۂ نبوت منقطع نہیں ہو سکتا، خدا جب ہر دور کا رب ہے تو لازماً ہر دور کے لیے وہ سامان ہدایت فراہم کرتا ہے۔ اس کے مالکِ یوم الدین ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اس نے دین کو لاوارث نہیں چھوڑا، بلکہ جونہی دین میں زوال آتا ہے، وہ نیا پیغمبر بھیج کر اسے غلبہ دے دیتا ہے۔

بہائیت کے نزدیک قیامت کی اصطلاح سے مراد کسی رسول کی دعوت کا ظہور ہے جو مردہ افراد کو زندہ کرتی ہے، اور موت کو دین کی زبان میں ترک اسلام کے معنی دیے گئے ہیں، اور قبر میں

سوال ملائکہ کا مطلب یہ ہے کہ نبی کے مبلغین لوگوں سے ان کے عقائد اور طریقوں کے متعلق پوچھ گچھ کرینگے جنت نبی کی تعلیم پر عمل کرنا ہے اور اس سے انحراف عذاب نار ہے۔ بہاء اللہ کے ذریعے امت مسلمہ پر قیامت کے وارد ہونے کی خبر سورۂ ق سے پیش کی گئی ہے ملاحظہ ہو واستمع یوم ینادالمناد من مکان قریب یوم یسمعون الصیحۃ بالحق۔ ذالک یوم الخروج۔ یہاں المناد سے مراد بہاء اللہ ہیں اور مکان قریب کا اشارہ ایران کی طرف ہے۔

فن استدلال کے ایسے لطائف میں سے ایک ملاحظہ ہو۔ ولکل امۃ اجل۔ ہر امت کی ایک مقرر مدت ہے۔ ولکل اجل کتاب۔ ہر دورِ معین کے لیے ایک کتاب الٰہی ہوا کرتی ہے۔ فمن اوتی کتابہ بیمینہ فاولئک یقرؤن کتابھم ولا یظلمون فتیلا۔ جو لوگ دہنے ہاتھ میں لے کر کتاب کو پڑھیں گے اور اس کا صحیح مدعا پائیں گے، ان کا کوئی حق ضائع نہ کیا جائے گا۔ ووضع الکتاب فتری المجرمین مشفقین مما فیہ۔ کتاب الٰہی کے نازل ہونے پر مجرم اس کے نوشتوں سے ڈر رہے ہوں گے۔

کوئی صحیح الدماغ شخص اس "دفتر معرفت" کا اول تو مطالعہ کر ہی نہ سکے گا، اور اگر کرلے گا تو کچھ گنوائے گا ہی، پائے گا کچھ نہیں!

سجاد حیدر یلدرم	مرتبہ سید سجاد الدین صاحب ایم۔اے۔ قیمت مجلد عہ

شائع کردہ:۔ ادارہ دانش و حکمت حیدرآباد، دکن۔

سجاد حیدر یلدرم اردو ادب کی تعمیر میں جلال الدین خوارزم شاہ، "خیالستان" "حکایات و احتساب" اور "ہما خانم" وغیرہ کے ذریعے جو حصہ ادا کر گئے ہیں اس سے اہل ذوق آگاہ ہیں۔ مرحوم کی سوانح اور ادبی جذبات کے تذکرے کی کمی کو پورا کرنے کے لیے جناب مرتب نے اس کتاب میں ان چند مضامین کو جمع کرکے شائع کر دیا ہے جو وقتاً فوقتاً سجاد اور اس کی نگارشات پر لکھے گئے ہیں۔ لکھنے والوں میں مولانا سید سلیمان ندوی، شوکت تھانوی، قاضی عبدالغفار اور بعض دوسرے معروف حضرات شامل ہیں۔ سجاد حیدر کی پرشکوہ نگارشات اس نئے جنینی دور ادب کے آخری مرحلہ سے تعلق رکھتی ہیں

جو قدیم درباری دور اور جدید "ترقی پسند" دور کے بیچ میں واقع ہے اور جس میں مشرقی جذبات کے ساتھ مغربی فکر کو گوندھنے کا وہ سلسلہ شروع ہوا جس کا خاتمہ بے اخلاق الحاد پرور ادب پر ہوا۔ یلدرم نے مغرب کے افکار کو درآمد کرنے والے معاصرین کے مقابلہ میں ترکی اثرات کو اردو میں منتقل کرنے کی نئی راہ نکالی ــــــ اور ان کا ایشیائی مزاج اس مہم میں خوب کامیاب رہا۔

پیش نظر مجموعۂ مضامین کے ذریعہ یلدرم کی ادبی حیثیت کا سرسری سا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ نیز مرحوم کی سوانح کی ایک جھلک بھی دیکھی جا سکتی ہے۔

میثاق الانبیاء از جناب ابو الکلام غازی محمد عبد الغنی صاحب۔ قیمت ۸/

ملنے کا پتہ :۔ دیندار انجمن، آصف نگر، خانقاہ سرور عالم، حیدر آباد، دکن۔

اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ میثاق الانبیا جیسی کتابیں لکھنے اور پڑھنے اور ان سے دلچسپی لینے والے دماغ کس ساخت کے ہوتے ہیں! خدا کے دین اور اس کی ہدایت افروز کتاب سے جاہلانہ تمسخر کی ایک دردناک مثال ہے، جس میں آیت مطہرہ "واذ اخذ اللہ میثاق النبیین" پر وہ ستم توڑا گیا ہے جس کی لپیٹ میں پورا دین اور جملہ انبیاء کے دین آ گئے ہیں۔

مرکز بحث یہ ہے کہ جملہ انبیائے کرام نے امت محمدی میں ہونے کی آرزو کی ہے، اس سے ظاہر ہے کہ اس امت کا ایک فرد جملہ انبیاء سے افضل ہے، اور پھر اس نظریہ کی روشنی میں مرزا غلام احمد صاحب قادیانی کے دعوائے نبوت ظلی کو پست ذوقی قرار دیا گیا ہے کیونکہ وہاں تو ایک جزئی نبوت کا ادعا کر کے اپنے رتبہ کو گرا دیا گیا حالانکہ دکن میں "صدیق دیندار چن بسویشور" صاحب تمام انبیاء کے فضائل کے جامع موجود ہیں اور ان کا فلسفہ ہر امتی کو جملہ انبیاء سے افضل بنانے کو حاضر ہے۔

اب اس بحث کی آبیاری کے لیے کتنی آیات و احادیث کا خون کیا گیا ہوگا، کتنے حقائق کا منہ نوچا گیا ہوگا، کتنی صداقتوں کو تاویل بازی کے خراد پر چھیل ڈالا گیا ہوگا اس کا اندازہ کرنا یوں تو کتاب کو پڑھے بغیر مشکل ہے، مگر نمونۃً ایک دو نکات لطیفہ ملاحظہ ہوں۔ "لانفرق بین احد من رسلہ" کی تشریح میں ارشاد ہوا ہے کہ اس آیت میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ سلم اور آپ کی امت

کے مقام کو پیش کیا گیا ہے۔ یعنی اے محمد تم اپنے ایمان میں تمام انبیاء کے مجموعی ایمان کو داخل کرو۔
...... اس آیت کا اختتام ونحن لہ مسلمون پر ہے، یہاں جمع متکلم سے مخاطب ہو کر امت کا مقام پیش کیا، یعنی ایک امتی بھی اپنے سینہ میں تمام نبیوں کے ایمان کو جمع کر کے مسلم کہلاتا ہے؟ اسی طرح ایک دوسری زرین تحقیق یہ ہے کہ "الٰہ" ہونا اللہ کی صفات میں سے کوئی صفت نہیں ہے، اور الٰہ کے معنی پیارے کے ہیں، قوم کا پیارا ان کا نبی ہوا کرتا ہے۔ اب لا الٰہ کے معنی یہ ہونے کہ تمام قوموں کے مطلوب و مرغوب و مقصود ان کے نبی ہی تھے، گویا کہ یہاں تمام نبیوں کی نفی کر کے الا اللہ میں ذات اللہ کا کمال حضور اکرم صلعم میں پیش کیا ہے۔"

پوری کتاب ایسے جواہر ریزوں کا ایک عظیم الشان خزانہ ہے۔

اردو ترجمہ مقدمہ مشکوٰۃ شریف مترجمہ خواجہ محمد شریف صاحب سہارنپوری فاضل دیوبند۔

قیمت عہ۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ اسلامی، ربانی روڈ، لاہور۔

مشکوٰۃ شریف کا مقدمہ علم حدیث کے متعلق بہت اچھے اجمالی اشارات پر مشتمل ہے۔ اس کا اردو میں منتقل ہو جانا دینی شغف رکھنے والے نوجوانوں کے لیے مفید ہے۔

کاغذ ذرا اور دبیز ہوتا تو اچھا تھا۔

تدوین حدیث از جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبہ دینیات، عثمانیہ یونیورسٹی۔

حیدرآباد، دکن۔ قیمت ۱۲؍۔ شائع کردہ:۔ ادارۂ دعوۃ الحق، بیگم بازار، کوچہ گھانس منڈی، حیدرآباد، دکن۔

مولانا گیلانی کا یہ مفید مقالہ تدوین حدیث کی تاریخ ہی پر مشتمل نہیں۔ بلکہ اس کے ساتھ حدیث کی اہمیت پر بھی اچھے اشارات اس میں آگئے ہیں۔ اس مقالہ سے منکرین حدیث اور نیم منکرین حدیث کی بعض غلط فہمیوں کا ازالہ ہو سکتا ہے۔

مطبوعات مکتبہ جماعت اسلامی

الجہاد فی الاسلام	۵/-/-
رسالہ دینیات	۱/۸/-
حقوق الزوجین	۱/۸/-
مسئلہ قومیت	۱/۸/-
مسئلہ جبروقدر	۱/-/-
تجدید و احیائے دین	۱/-/-
اسلامی عبادات پر تحقیقی نظر	۱/-/-
قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں	۱/۳/-
سیاسی کشمکش حصہ اول	۱/۳/-
سیاسی کشمکش حصہ دوم	۲/۸/-
سیاسی کشمکش حصہ سوم	۲/-/-
پردہ	۲/۸/-
تنقیحات	۲/۸/-
خطبات	۲/۳/-
تفہیمات	۳/۸/-
حقیقت توحید	۱/۲/-
اسلام اور ضبط ولادت	-/۱۲/-
ہیگل مارکس اور نظام اسلام	۲/۸/-
رسالہ دینیات (انگریزی)	۳/۸/-
اسلام کیا ہے (انگریزی)	۱/۸/-
ایمان کے بعد کیا (")	-/۱۲/-
سلامتی کا راستہ	-/۶/-
اسلام کا نظریہ سیاسی	-/۶/-
اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے	-/۶/
انسان کا معاشی مسئلہ	-/۶/
اسلام کا اخلاقی نقطہ نظر	-/۶/-
نیا نظام تعلیم	-/۶/-
دین حق	-/۶/-
اسلام اور جاہلیت	-/۶/-
ایک اہم استفتا	-/۲/-
دستور جماعت اسلامی	-/۲/-
روداد جماعت اسلامی حصہ اول	-/۱۰/-
روداد جماعت اسلامی حصہ دوم	-/۹/-
روداد جماعت اسلامی حصہ سوم	۱/-/-

ملنے کا پتہ

مکتبہ جماعت اسلامی

دارالاسلام، پٹھان کوٹ (پنجاب)

مطبوعہ دین پریس، لاہور